افسانوں کا مجموعہ

روح کا کرب

دیپک بُدکی

میزان پبلشرز

مصنف کی تصانیف

☆افسانوں کے مجموعے:

۱۔ادھورے چہرے (اردو اور ہندی)

۲۔چنار کے پنجے (اردو اور ہندی)

۳۔زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

۴۔ریزہ ریزہ حیات

۵۔روح کا کرب

۶۔مُٹھی بھر ریت (افسانچوں کا مجموعہ)

☆تنقیدی مضامین و تبصروں کے مجموعے:

۶۔عصری تحریریں

۷۔عصری شعور

۸۔عصری تقاضے

۹۔عصری تناظر

۱۰۔ اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار اور دیگر مضامین و تبصرے

مصنف پر لکھی گئی کتابیں

۱۔دیپک بُد کی کی افسانہ نگاری (جاوید اقبال شاہ)

۲۔ورق ورق آئینہ۔دیپک بدکی: شخصیت اور فن

(پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری)

روح کا کرب

(افسانوں کا مجموعہ)

دیپک بُدکی

میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)
متصل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈ کوارٹرس
بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر۔ ۱۹۰۰۰۹

ISBN- 978-93-80691-xx-x

نام کتاب : روح کا کرب (افسانے)

مصنف : دیپک بُدکی

اشاعت : پہلا ایڈیشن ۲۰۱۵ء

قیمت : تین سو روپے

مطبع : میزان پرنٹرس، سرینگر، کشمیر

ناشر : میزان پبلشرز، بالمقابل فائر اینڈ ایمر جنسی سروسز،
بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-190009

RUH KA KARAB

(Short Stories)

Author :Deepak Budki

Price : Inland :Rs 300/- ; Foreign $ 10/-

Publishers : **Meezan Publishers**
Opp. Fire & Emergency Services Hqtrs
Batmaloo, Srinagar, Kashmir-190009
Tel: Off: 0194-2470851 Fax:2457215

Mobile : 9419002212; 8494002212

e mail : meezanpublishers@rediffmail.com

انتساب

اپنے بیٹے و بہو

ونیت اور ندھی

کے نام

تحریر ظہری

اس مجموعے کے سبھی کردار ، مقامات اور واقعات فرضی ھیں۔ کسی شخص ، مقام یا واقعہ سے کوئی مناسبت محض اتفاق ہو سکتا ھے جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمّے داری عاید نہیں ھوگی۔

سپاس نامہ

اس مجموعے میں شامل افسانے مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں اور قارئین سے دادِ تحسین پا چکے ہیں۔ رسالوں اور اخبارات کے نام یوں ہیں:-

ٹکڑوں میں بٹی زندگی (ایوان اردو، جلد ۲۵، شمارہ ۸، دسمبر ۲۰۱۱ء؛ شعروسخن اردو ویب میگزین ٹورنٹو، نومبر-دسمبر ۲۰۱۲ء؛ صبح بہاراں لاہور، نومبر ۲۰۱۳ء)، کاگ پورنیما [بعنوان کوؤں کی پورنماشی] (شاعر ممبئی، جنوری-فروری ۲۰۱۴ء؛ ہندی ترجمہ کوشر سماچار، جلد ۶۳، شمارہ ۱۱، فروری ۲۰۱۵ء)، بستے کا بوجھ (تریاق ممبئی، نومبر ۲۰۱۴ء؛ کاوش شاہجہاں پور اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۴ء)، ڈاگ ہاؤس (ایوان اردو، جلد ۲۸، شمارہ ۴، اگست ۲۰۱۴ء، ارتقا کراچی پاکستان، شمارہ ۵۸، اگست ۲۰۱۴ء) طلسمی عینک (دیدہ ور باسٹن، شمارہ ۱۳، جولائی-ستمبر ۲۰۱۱ء؛ روزنامہ کشمیر عظمیٰ سرینگر، ۱۰ جولائی ۲۰۱۱ء)، میں انا ہوں (روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی، ۲ دسمبر ۲۰۱۲ء؛ شاعر ممبئی، جلد ۸۴، شمارہ ۲-۱، جنوری -فروری ۲۰۱۳ء؛ سہ ماہی کاوش شاہجہاں پور، جلد ۱، شمارہ ۳، اپریل- جون ۲۰۱۴ء)، روح کا کرب (چہار سو راولپنڈی پاکستان، جلد ۲۱، مارچ-اپریل ۱۲ء؛ نشاط کویت، جلد ۲۱، جولائی ستمبر ۱۲ء؛ فکرِ نو لاہور، جلد ۴، شمارہ ۴، مارچ-اپریل ۱۳ء؛ شاندار اعظم گڑھ، جلد ۱۰، شمارہ ۹-۱، جولائی ۲۰۱۳ء؛ روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی ۲۲ ستمبر ۲۰۱۳ء؛ ادب لطیف جلد ۷۸، شمارہ ۱۲، لاہور، دسمبر ۲۰۱۳ء)، گونگا کیئر ٹیکر (انتساب، جلد ۳۲، شمارہ ۹۱، جولائی-ستمبر ۲۰۱۳ء؛ شیرازہ کشمیر، جلد ۵/ شمارہ ۵۱)، زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا (اردو الائیو آن لائن، ۳۱/ اکتوبر ۲۰۱۱ء؛ تریاق ممبئی، جلد ۱، شمارہ ۹، اپریل ۲۰۱۲ء؛ تفہیم راجوری، جلد ۱، شمارہ ۱، جون-دسمبر ۲۰۱۲ء)، ترنّد (شاعر ممبئی ستمبر، جلد ۸۲، شمارہ ۹، ۲۰۱۱ء؛

روزنامہ کشمیر عظمیٰ سرینگر، ۱۲ اگست ۲۰۱۲ء)، زندگی سوچ کر اُداس ہو گیا میں (اردو سخن آن لائن، ۲۸ نومبر ۲۰۱۱ء، اردو لائیو آن لائن، روزنامہ کشمیر عظمیٰ سرینگر [بعنوان تجھے اے زندگی کہاں سے لاؤں] ۹ دسمبر ۲۰۱۲ء)، الم آشنا دل، بیسویں صدی نئی دہلی [افسانہ نمبر] جلد ۸۴، شمارہ ۲، جولائی - دسمبر ۲۰۱۴ء)، پراویڈنٹ فنڈ (سہیل کولکتہ، جلد ۴، شمارہ ۸-۷، جولائی - اگست ۲۰۱۴ء)، انٹرویو (روزنامہ کشمیر عظمیٰ سرینگر، ۶ دسمبر ۲۰۱۲ء، سہیل کولکتہ، جلد ۱، شمارہ ۲، مارچ ۲۰۱۳ء؛ شاندار اعظم گڑھ، جلد ۱۱، شمارہ ۷-۱، مئی ۲۰۱۴ء)، جھوٹا سچ (روزنامہ کشمیر عظمیٰ سرینگر، دسمبر ۲۰۱۰ء؛ ہمارا مقصد، ۳ جنوری ۲۰۱۱ء؛ دیدہ ور باسٹن، جنوری ۲۰۱۱ء)، حسرتوں کا مدفن (چہار سو راولپنڈی [بعنوان آفت کی پوٹ]، جلد ۲۲، ستمبر - اکتوبر ۲۰۱۳ء؛ بیباک مالیگاؤں [افسانہ نمبر] جلد ۸، شمارہ ۹۶-۹۵، اگست - ستمبر ۲۰۱۴ء)، یونین لیڈر (روزنامہ کشمیر عظمیٰ سرینگر، ۲۵ ستمبر ۲۰۱۱ء؛ روزنامہ انقلاب دہلی؛ ۱۸ دسمبر ۲۰۱۱ء)۔

ان سب مدیر حضرات کا میں سپاس گزار ہوں جنھوں نے میرے افسانوں کو اپنے گراں قدر رسالوں اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً جگہ دی۔ علاوہ ازیں ان ادیبوں اور قارئین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مختلف رسالوں میں میرے افسانوں پر اپنی مخلصانہ رائے کا اظہار کیا۔

مجموعے کی کمپوزنگ، تزئین وترتیب خاکسار نے خود ہی کر لی ہے البتہ شبیر احمد، ناشر و پراپرئٹر، میزان پبلشرز، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر کے تعاون کے بغیر اس کتاب کو اہتمام کے ساتھ منظر عام پر لانا ناممکن تھا۔ اس لیے ان کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ آخر میں اپنے دوست پروفیسر انور ظہیر انصاری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی بدستور تحریک دیتی رہی۔

دیپک بدکی

☆☆☆

فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

افسانوں کا ایک اور مجموعہ 'روح کا کرب' حاضرِ خدمت ہے۔ یہ میرا پانچواں مجموعہ ہے۔ اس سے قبل چار افسانوں کے مجموعے 'ادھورے چہرے'، 'چنار کے پنجے'، 'زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی' اور 'ریزہ ریزہ حیات' منصۂ شہود پر نمودار ہو چکے ہیں۔ پہلے مجموعے کے تین ایڈیشن اور دوسرے مجموعے کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مزید ان کے ہندی ایڈیشن بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، کئی افسانوں کے ترجمے کشمیری، انگریزی، ہندی، مراٹھی اور تیلگو زبانوں میں چھپ چکے ہیں۔

'روح کا کرب' میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے ۲۰۰۹ء کے بعد قلم بند کیے جا چکے ہیں۔ اکثر افسانوں میں کچھ پرانی یادیں تازہ کی گئی ہیں کیونکہ ان کی سماجی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ اس کے برعکس کچھ افسانوں جیسے 'میں اَنا ہوں' میں تازہ ترین سیاسی منظرنامے کی عکاسی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں سن ۲۰۱۰ء میں نوکری سے سبکدوش ہوا۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی کی گاڑی خطرناک ٹریفک جام میں پھنس چکی ہے۔ نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ پاتی ہے۔ ممکن ہے اگر میں کشمیر میں اقامت پذیر ہوتا اور جبری ہجرت کا شکار نہ ہوا ہوتا شاید ایسے حالات سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ وہاں دوست احباب تھے، رشتے ناتے تھے، رسالوں اور اخباروں کے مدیروں سے دوستی تھی، ریڈیو اور ٹی وی کے پروڈیوسروں سے جان پہچان تھی اور سب سے بڑھ کر کافی ہاؤس تھا جہاں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ کہیں نہ کہیں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرنے کی سبیل نکل ہی

جاتی۔اس کے برعکس یہاں بے گھری ہے، بے زمینی ہے اور تنہائی ہے۔ہر چہرہ اجنبی لگتا ہے۔ شناخت کا مسئلہ وجود کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔اس کیفیت کی عکاسی کچھ حد تک 'ڈاگ ہاؤس' اور 'کوؤں کی پورنماشی' میں مل سکتی ہے۔'طلسمی عینک' اور 'گونگا کیئر ٹیکر' بھی کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔جہاں تک 'ترنذ' کا سوال ہے یہ افسانہ ایک سچّے واقعے پر مبنی ہے جو ملی ٹنسی سے تقریباً ستائیس سال پہلے پیش آیا تھا مگر ڈر اور خوف کا عالم بالکل ویسا ہی تھا جیسا ۱۹۹۰ء میں ملی ٹنسی کے دوران پیدا ہوا۔کہیں کوئی پتا ہلتا تو یوں لگتا کہ موت بلا رہی ہے۔میری خوش نصیبی رہی کہ ملازمت کے سبب مجھے ہندستان کے مختلف علاقوں کے باشندے اور ذیلی ثقافتیں دیکھنے کے مواقع ملے۔اس مشاہدے نے کئی افسانوں کا مواد فراہم کیا۔یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ کئی کہانیوں کے ساتھ میں ذاتی طور پر کہیں نہ کہیں جڑا ہوا ہوں اور ان سے خود کو الگ کر پانا میرے لیے مشکل تھا۔

میں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ ناقدین کے کلماتِ تحسین و تنقید اور قارئین کی محبتوں نے ہمیشہ میرے حوصلے کو تقویت پہنچائی ہے۔ان سب باتوں سے نہ صرف ذہنی تسکین ملتی رہی بلکہ دل کو فرحت و بشاشت فراہم ہوئی۔مجھے پوری امید ہے کہ آگے بھی قارئین اسی گرم جوشی اور انہماک سے میرے افسانوں کا مطالعہ کرتے رہیں گے اور اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں گے۔گر قبول افتد زہے عزو شرف۔

وسُندھرا،غازی آباد-۲۰۱۰۱۲

دیپک بدکی

۱۵ اپریل ۲۰۱۵ء

ٹکڑوں میں بٹی زندگی

''ریزرویشن !'' وہ سوچنے لگی۔ ''ریزرویشن نہ ہوتی تو میں اس مقام تک کیسے پہنچ پاتی ؟''

ایک غریب قبیلے میں پلی بڑھی لڑکی۔ گھر کے سبھی لوگ جنگل سے جڑی بوٹیاں جمع کر کے کمپنی کے ٹھیکیداروں کو بیچتے اور اس طرح اپنا پیٹ پالتے۔ گھر کیا تھا... بس مٹی کی لپی پتی دیواریں، گھاس پھوس کی چھت، اٹھنے بیٹھنے اور سونے کا تاریک کمرہ جس کے ایک کونے میں رسوئی تھی۔ جھونپڑی کے اردگرد دو چار لوکی اور تُرئی کی بیلیں چڑھی تھیں جن سے وقتاً فوقتاً کنبے کے لیے سبزی فراہم ہوتی۔ ایک بھینس اور دو بکریاں بھی پال رکھی تھیں جو جنگلی گھاس کے رحم و کرم پر جی رہی تھیں۔ اس کے باوجود کنبے کو دودھ مہیا کرنے میں کوئی بخیلی نہیں کرتی تھیں۔

''ریزرویشن سے زیادہ اس پادری نے میری زندگی بنائی جس نے ساتھ والے گاؤں میں مشنری اسکول کھولا اور گردونواح میں علم کی روشنی پھیلائی۔'' میکھلا بیڈ پر لیٹی، ہاتھ میں انگریزی ناول لیے فکر و تردد کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ ''اور یہ لوگ جو آج پسماندہ طبقوں کے خیر خواہ بنے پھرتے ہیں ان کا تو کہیں وجود بھی نہ تھا۔ آج اتنے سالوں کے بعد بھی ہمارے علاقے میں اس مشنری اسکول کے سوا اور کوئی اسکول نہیں ہے۔ کہاں ہیں وہ ہندو اور مسلم تنظیمیں جو قبائل ذاتوں اور پسماندہ لوگوں کا دم بھرتی ہیں؟ آئے دن دھرم کے نام پر ہزاروں لاکھوں روپے جمع کرتی ہیں؟ جہاں دیکھو وہاں مندر اور مسجدیں تعمیر کرتی ہیں۔ انسان کو فراموش کر کے ایشور کو خوش کرنے کی بے سود کوششیں کرتی ہیں۔ خوش حال شہروں اور دیہاتوں میں تبلیغ کرنا کس کو نہیں آتا۔ اور دیکھو کیسے ہر

دم گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے رہتے ہیں کہ یہ مشنری لوگوں کو جبراً اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے اُکساتے ہیں۔ میں نے بھی مشنری سکول ہی میں تعلیم پائی ہے مجھے تو کسی نے آج تک مذہب بدلنے کے لیے نہیں کہا۔"

میکھلا نے بے چین ہو کر کروٹ بدل لی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے انڈین سول سروسز کا امتحان پاس کیا تھا۔ سب سے پہلے وہ سکول کے فادر کے پاس یہ مژدہ سنانے گئی تھی۔ راہب کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ایشور کا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر میکھلا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کو آشیرباد دیتے ہوئے کہا تھا۔

"مائی ڈیئر چائیلڈ، گاڈ بلیس یُو۔ میری ایک بات یاد رکھنا۔ ہم جیسے کم ظرف لوگ زندگی میں ترقی پا کر اپنی جڑوں کو بھول جاتے ہیں۔ میکھلا چاہے کچھ بھی ہو، اپنی جڑوں کو کبھی نہیں بھولنا۔ عموماً وہ لوگ جو پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں طاقت کے نشے میں چور ہو کر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی اسی خمیر سے بنے ہوئے ہیں۔"

پادری کی اس بات کا تجربہ اس کو کئی بار ہوا۔ نوکری کے دوران میں اس نے محسوس کیا کہ شمال مشرق کے قبائلی افسر اپنے وجود کو بھول کر صرف شراب اور شباب میں ڈوب جاتے ہیں اور اپنے سماج کی بہبود کے لیے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھاتے۔ اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اعلیٰ طبقوں سے وابستہ افسران کے سالانہ کانفِڈنشل رپورٹ خراب کرتے ہیں۔ اسے بخوبی یاد تھا کہ ابتدا میں اس کے ساتھ چار اور درجہ فہرست افسر بھرتی ہوئے تھے لیکن یہاں تک آتے آتے سب راستے ہی میں لڑھک گئے۔ بس ایک وہی بچی تھی جس کی پرموشن کوئی نہیں روک سکا ورنہ جادۂ حیات میں بے شمار گدھ تاک لگائے بیٹھے تھے۔

دراصل ہندوستانی بیوروکریسی میں افسر کو ہر قدم پر سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ وہ چاہے اصول ہوں یا اخلاقی قدریں، بود و باش ہو یا پہناوا، زبان ہو یا اندازِ تخاطب۔ لیکن فادر کی نصیحتیں عمر بھر

میکھلا کی رہنمائی کرتی رہیں۔ وہ ہمیشہ زمین سے جڑی رہی۔

زندگی میں میکھلا کئی تلخ تجربات و حادثات سے گزرتی رہی۔ ایک بار اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ نچلی عدالتوں اور عدالتِ عالیہ سے بری ہونے کے باوجود درجہ فہرست ذات کے ایک پوسٹل کلرک سنت داس کو تین ہزار کے گھپلے کی پاداش میں سی بی آئی نے دس سال معطل رکھا جب تک اس کی ہمت جواب دے بیٹھی۔ حالانکہ رقم معمولی تھی پھر بھی سی بی آئی نے ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی۔ اس کے برعکس اونچے طبقے کے کئی ملازم لاکھوں کا غبن کر کے بھی چھوٹتے رہے کیونکہ ان کے خلاف سی بی آئی کے افسر پکے ثبوت نہیں جٹا پائے یا یوں کہیے کہ وہ عمداً ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی جیبیں گرم ہو چکی تھیں۔ ایک ادنیٰ ملازم کے لیے سپریم کورٹ تک اپنے کیس کی پیروی کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سنت داس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس پتھر کی دیوار کو توڑنے کے بدلے اپنا ہی سر پھوڑ رہا ہے۔ بے چارے کو دس سال فاقے کرنے پڑے۔ ساری جمع پونجی کیس کی پیروی کرنے میں خرچ ہو گئی۔ مگر مرتے دم تک افسر شاہی اس کے بنیادی حقوق کی ان دیکھی کرتی رہی اور اسے کہیں بھی انصاف نہ ملا۔

دفعتاً میکھلا کے کانوں میں سنت داس کی آواز بازگشت بن کر گونجنے لگی۔

''میڈم، اب میں ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ سپریم کورٹ نے بھی مجھے بری کر دیا ہے۔ اس کے باوجود مجھے وقت وقت پر جو ترقی ملنی چاہیے تھی آج تک نہیں ملی اور نہ ہی اس کا کوئی فائدہ ملا۔ اس دوران میں میری بیوی سورگباش ہو گئی۔ ایک لڑکا تھا وہ بھی بھگوان کو پیارا ہو گیا۔ اب آپ پوچھ رہی ہیں کہ اس وقت میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ اب آپ کیا کر سکتی ہیں؟ مگر سچ کہتا ہوں کہ آج مجھے پہلی بار تسکین اور اطمینان حاصل ہوا۔ معلوم ہے کیوں؟ کم سے کم اتنے برسوں بعد ایک افسر تو ایسی ملی جس نے میری پوری رام کہانی سن لی اور

میرے ساتھ ہمدردی جتائی۔'' اپنی کہانی سناتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

میکھلا کو زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ آدمی بر سر اقتدار ہو کر بھی کبھی کبھار کتنا مجبور اور لاچار ہو جاتا ہے۔ اس جکڑ کوٹ انتظامیہ میں وہ دوسرے آدمی پر ہو رہے ظلم و ستم کی تلافی نہیں کر پاتا۔ اتنے بڑے عہدے پر براجمان ہو کر بھی میکھلا اپنے ماتحت پر ماضی میں ہوئی زیادتیوں کا کفارہ ادا نہیں کر پا رہی تھی۔

کچھ برس بعد ایک اور واقعہ پیش آیا۔ میکھلا کی پوسٹنگ مہاراشٹر ہوگئی۔ وہاں ذات پات کا چلن ان دنوں بھی زوروں پر تھا۔ اونچی ذات کے افسر پچھڑی جاتی کے ملازموں کی فائلوں میں خواہ مخواہ اڑنگے ڈال رہے تھے اور ان کی پرموشن روکنے کی حتی الامکان کوشش کر رہے تھے۔ تنگ آکر ایک معتوب پوسٹ ماسٹر شیڈیول کاسٹ کمیشنر کو چٹھیوں پر چٹھیاں لکھتا رہا۔ میکھلا نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس کی پرابلم جاننا چاہی۔ دراصل اس پوسٹ ماسٹر کو اونچے طبقے کے افسر نے ایک جھوٹے کیس میں ملوث کیا تھا تاکہ وہ مزید ترقی نہ پا سکے۔ میکھلا کو جب افسر کی کارستانیاں سمجھ میں آگئیں اس نے معطلی کا آرڈر منسوخ کر لیا اور پوسٹ ماسٹر کو اگلے کچھ مہینوں میں سارا کیس رفع دفع کرنے کا بھروسہ دے دیا۔ اس نے پوسٹ ماسٹر کو یہ بھی سمجھایا کہ وہ ایسے خطوط لکھنے پر فضول اپنی قوت ضائع نہ کرے کیونکہ ان سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کمیشنر کے پاس ہر روز ایسے ہزاروں خطوط آتے رہتے ہیں، پھر ان سب کی پیروی کرنا کہاں تک ممکن ہے۔ شومئ قسمت یہ کہ پانی پوسٹ ماسٹر کے سر سے اونچا ہو چکا تھا اور وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ پوسٹ ماسٹر نے خودکشی کر لی اور پولیس ڈاک خانے میں تفتیش کر رہی ہے۔ پوسٹ ماسٹر کی جیب سے جو نوٹ ملا اس پر صاف لکھا تھا کہ ''میری موت کا ذمہ وار صرف میرا افسر ہے جس نے کئی سالوں سے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔'' اس نوٹ کے باوجود کچھ بھی نہ ہوا۔ تھوڑی سی تفتیش، تھوڑا سا ڈرامہ

اور پھر کیس داخل دفتر۔ میکھلا کو یقین ہوا کہ ہمارے دیش میں غریب آدمی کے لیے سارے راستے بند کر دئے گئے ہیں۔

البتہ ایک بار میکھلا کو اس لمبی تاریک سرنگ میں روشنی کی چھوٹی سی کرن نظر آئی تھی۔

اس کی پہلی پوسٹنگ کے دوران اس کی ملاقات ایک آسودہ گھرانے کے چشم و چراغ سے ہوئی۔ لڑکے نے ایم اے جرنلزم کیا تھا۔ چھبیس جنوری کے دن دونوں گورنر کے یہاں مدعو تھے اور ایک ہی ٹیبل پر براجمان تھے۔ لڑکے نے اپنا تعارف پیش کرنے میں پہل کی۔

''میں ہوں کارتک اگروال۔ روزنامہ وائس آف انڈیا کا کارسپانڈنٹ۔''

''اوہ آئی سی۔ میرا نام ہے میکھلا۔ یہاں بحیثیت سینئر سپرانٹنڈنٹ پوسٹ آفسز کام کرتی ہوں۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔''

پھر ان کے درمیان مکالمہ شروع ہوا۔ ان دنوں ریزرویشن پر ہر طرف بحث چل رہی تھی سو وہ بھی اسی موضوع پر خیالات کا تبادلہ کرنے لگے۔ اس بارے میں کارتک نے خود کو ترقی پسند اور اشتراکی ظاہر کیا اور میکھلا کو ایسا لگا کہ اس کے دل میں پچھڑے طبقوں کے لیے بہت ہمدردی ہے۔ میکھلا نے بھی صاف بیانی سے کام لیا۔

''پچھڑی جاتی اور جن جاتی کے لوگ ابھی بھی اس قابل نہیں ہوئے ہیں کہ وہ اونچے طبقے کے لوگوں سے براہِ راست مقابلہ کر سکیں۔ ان کا یہ ہینڈی کیپ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا جب تک ہمارے سماج میں مساوات اور یکسانیت نظر نہیں آتی۔ البتہ ان جاتیوں کے جو لوگ آسودہ حال ہو چکے ہیں انہیں یہ رعایت دینا جائز نہیں ہے۔''

''میں آپ سے سہمت ہوں۔ دراصل ان جاتیوں کا شوشن ہزاروں سالوں سے کیا جارہا ہے۔ سماجی بہشکار، مالی بدحالی اور فیصلہ کرنے کی مشینری سے دور رکھنے کی کوشش! نسل در نسل کے

اس استحصال کا خمیازہ تو ہمیں اٹھانا ہی پڑے گا۔"

"نہیں کارتک جی، آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں آج کی نسل کو گزشتہ نسلوں کی بھرپائی کے لیے نہیں کہتی مگر اتنا ضرور کہتی ہوں کہ موجودہ دور میں کم سے کم سب لوگوں کو برابری کا حق مل جانا چاہیے۔ وہ تو تب ہی ہوگا جب سبھی کو یکساں مواقع فراہم ہوں۔ اب آپ ہی دیکھیے ایک معمولی ان پڑھ موچی کا بیٹا ایک پڑھے لکھے برہمن پروفیسر کے بیٹے سے کمپٹیشن میں کیسے سبقت لے سکتا ہے۔ اس کے گھر میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے جب کہ دوسرے کے گھر میں علم کی مشعلیں جل رہی ہیں۔"

اس ملاقات کے بعد کارتک اور میکھلا آپس میں ملتے رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا پیار بھی پروان چڑھتا رہا اور نوبت شادی تک پہنچ گئی۔ لیکن کارتک کے گھر والوں نے میکھلا کو اپنی بہو بنانے سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ اس کی ذات ان کے برابر نہ تھی۔ کارتک نے بہت سمجھایا بجھایا مگر بات آگے نہ بڑھ سکی یہاں تک کہ باپ نے اسے وارننگ دی کہ اگر تم شادی کرنے پر مصر ہو تو تمہیں اپنی موروثی جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ کارتک نے کافی سوچ بچار کے بعد آخرکار اپنے بڑھتے قدم روک لیے جبکہ دوسری جانب میکھلا نے اس فیصلے کو اپنا مقدر سمجھ کر چپ چاپ قبول کر لیا۔

آج اتنے برسوں کے بعد اس کے ذہن میں بس ایک ہی سوال اٹھ رہا تھا۔

"کارتک نے گھر بار چھوڑ کر مجھے کیوں نہیں اپنایا؟ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ قومی اخبار میں کام کر رہا تھا۔ میں بھی گورنمنٹ نوکری کر رہی تھی۔ دونوں ساتھ مل کر زندگی کی کشتی کھے سکتے تھے۔" پھر وہ من ہی من میں اپنے بھولپن پر مسکرائی اور خود کو سمجھانے لگی۔ "ہر مرد بغاوت کر کے اپنی زندگی میں کانٹے نہیں بونا چاہتا۔ نوخیزی میں ہر انسان کی رگوں میں بغاوت کا خون تیزی سے دوڑتا ہے مگر تجربات کے ساتھ ساتھ مدھم پڑ جاتا ہے۔ شاید اس کے دماغ میں بھی الکحول فتور تھا اور جب اپنی

جان پر بن آئی تو سہارا نہ پایا۔"

وہ پھر سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی۔ "یہ بھید بھاؤ ہمارا ورثہ ہے۔ درونا چاریہ نے اکلویہ کا انگوٹھا اس لیے کٹوایا تھا تا کہ اس کے کھشتری شاگرد کو قبائل ذات سے منہ کی نہ کھانی پڑے۔ بھگوان رام نے شبری کے ہاتھ کے بیر تو کھا لیے مگر اس کی اور اس جیسے لوگوں کی حالت سدھار نہیں پایا۔ آج بھی ہماری ذہنیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ ریزرویشن کے باوجود دوبے، چوبے، مشرا، ترپاٹھی، سکسینہ اور سنہا اعلیٰ کرسیوں پر براجمان ہیں۔ بیس سے زیادہ فیصد پچھڑے لوگ آل انڈیا سروسز میں داخل ہوتے ہیں مگر سیکریٹری کے رتبے تک پہنچتے پہنچتے ایک دو فیصد ہی رہ جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اونچی ذات کے افسران کے راستوں میں کانٹے بچھاتے ہیں۔ بغل میں چھری اور منہ میں رام رام۔ سچ تو یہ ہے کہ آج اس سماج میں منتھن کی ضرورت ہے اور ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو اس منتھن سے نکلے زہر کو پی جائے نہ کہ اپنی اور اپنے پیش رووں کے بت بنا کر ان کی تشہیر کرے۔"

سوچتے سوچتے اس نے اپنے منہ پر کتاب رکھ لی اور پھر اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب سو گئی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی اس کا سر بھاری بھاری سا تھا۔ رات بہت دیر تک جاگی تھی پھر بھی وہ سمجھ نہیں پائی کہ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ بہر حال اسے لگ رہا تھا کہ آج ایک نئی میکھلا نے جنم لیا ہے اور وہ اپنی زندگی کو ضائع نہیں ہونے دے گی۔

دفتر پہنچتے ہی اس نے والنٹری ریٹائرمنٹ کے لیے اپنی درخواست اعلیٰ افسر کو بھیج دی۔ منظور ہونے کے کچھ دن بعد اس نے درجہ فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے بچوں میں تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ایک این جی او بنا لیا اور پھر رات دن اس کے ساتھ جڑ گئی۔ اس کام سے جو تسکین میکھلا کو ملی اس کا تجربہ اسے پوری گورنمنٹ سروس کے دوران نہیں ہوا تھا۔

کئی سال یوں ہی بیت گئے۔ اس کی کاوشوں سے ہزاروں غریب نادار بچوں کو علم کی

[illegible] کا اعتراف یونی سیف اور کئی دیگر عالمی اداروں نے کیا۔ چند دن پہلے کی [illegible] سے ریمون میگ سیسے ایوارڈ لے کر دہلی واپس آئی۔ آج اس کے استقبال کے لیے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر کافی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔

ایئرپورٹ پر اس کا انٹرویو لینے کے لیے روزنامہ وائس آف انڈیا کا ایسوسیئٹ ایڈیٹر دیپک اگروال بھی انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

کاگ پورنیا

کیلاش پنڈت بہت بے چین ہورہا تھا۔اسے بچپن کا ایک قصہ یاد آیا تھا جسے وہ اپنے پوتے کو سنانے کے لیے بے تاب ہورہا تھا۔بڑھاپے میں آدمی کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے پاس بیٹھے، اس کو کنبے کا فرد سمجھے اور اس کی بات غور سے سنے ورنہ حاشیہ سازی اس کو گھن کی طرح چاٹ کھاتی ہے۔اس نے اپنے پوتے سنّی کو آواز دی۔

تجربات کا ذخیرہ اس کے اندر کلبلا رہا تھا......ایک صدی کی نارسائیاں، اخلاقی پستیاں اور زوالِ انسانیت کی کہانیاں جنھیں احساس کی فراست اور جذبات کی شدت نے جلا دی تھی۔

سنّی فوراً دوڑتا ہوا چلا آیا اور فرمانبردار بچّے کی طرح آلتی پالتی مار کر سامنے بیٹھ گیا۔

کیلاش پنڈت بچپن کی یادوں کو سمیٹتا ہوا اپنی جڑوں کی کھوج میں بہت دور نکل گیا۔وہ پچپیس سال پہلے چھوٹی ہوئی دھرتی کی رومان بھری فضاؤں میں کھو گیا لیکن کچھ پلوں کے بعد اس کی گویائی لوٹ آئی۔اس نے اپنی رام کہانی شروع کردی۔

سردیوں کا موسم تھا۔میں زندگی کے سفر کا پندرہواں میل پار کر چکا تھا۔نیند سے جاگا تو دیکھا کہ گھر میں عجیب سی گہما گہمی ہے۔صبح ہی سے برت کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔میں نے اپنے پتاجی سے پوچھ لیا ''پاپا، آج کوئی بڑا دن ہے کیا؟''

''بیٹے آج 'کاوَپونم' یعنی 'کاگ پورنیا' ہے۔''

''کاگ پورنیا! کوؤں کی پورنماشی!'' میں نے حیرانی سے پوچھ لیا۔

''ہاں بیٹے...ان دنوں ہر سال سائبیریا اور روس کے دیگر شمالی علاقوں سے مہاجر کوّے

ہزاروں لاکھوں میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں چلے آتے ہیں۔ہم ان کی سواگت کے لیے یہ تیوہار مناتے ہیں۔تم باہر جا کر دیکھ لو۔آج کل تمھیں چھتوں پر... دیواروں پر... پیڑوں پر... غرض ہر جگہ کالے کلوٹے کوّے نظر آئیں گے جو چونچ سے دُم تک کوئلے کی مانند سیاہ ہوتے ہیں۔"

میرے تجسس کو پتا جی نے مہمیز لگائی۔ایسا نہیں تھا کہ کشمیر میں جاڑوں کے علاوہ کوّے نظر نہیں آتے۔وادی میں سال بھر کوّے دکھائی دیتے ہیں مگر ان کا رنگ ہلکا سیاہی مائل ہوتا ہے، کاجل کی مانند گہرا سیاہ نہیں ہوتا اور ان کی گردن کے اردگرد سفید حلقہ سا بنا ہوتا ہے۔علاوہ ازیں مقامی کوؤں کی آواز قدرے کرخت اور بھاری ہوتی ہے۔ جہاں تک موسمی پہاڑی کوّوں کا سوال ہے وہ گرمیوں میں قطب شمالی کے آس پاس اپنا مسکن بناتے ہیں اور سردیوں میں انتہائی ٹھنڈ اور خوراک کی عدم دستیابی کی وجہ سے جھنڈ کے جھنڈ ایسے علاقوں کی جانب ہجرت کرتے ہیں جدھر موسم قدرے بہتر ہوتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ پیٹ انسان کو ہی نہیں بلکہ پرندوں کو بھی ہجرت کرنے پر مجبور کرتا ہے۔وہ بلند و بالا کوہساروں، یخ بستہ صحراؤں، گھنے جنگلوں، تپتے ریگ زاروں اور بے کراں سمندروں کو عبور کر کے جینے کی تدبیریں کرتے ہیں۔

عین ممکن تھا کہ ہم نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی ہوتی اگر ہمارے اسلاف نے موسم سرما میں ان کالے کوؤں کے پرے آتے ہوئے نہ دیکھے ہوتے۔کوّا تو آخر کوّا ہوتا ہے، وہ چاہے کالا بھٹ ہو یا پھر دھاری دار سیاہی مائل۔ہمارے بزرگ یہ جانکاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے کہ یہ ننھے جانور اناج کے چند دانوں کی خاطر ہر سال ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔وہ پُشت در پُشت ان کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے رہے۔جس طرح آج کل ویلنٹائن ڈے، فادرس ڈے اور مدرس ڈے منائے جاتے ہیں اسی طرح ان مہاجر کوؤں کی آمد کی خوشی میں کاگ پورنیما منائی جاتی ہے۔

شدید ٹھنڈ کے باوجود اس روز ماں نور کے تڑکے ہی جاگ اٹھی اور گھر کی صفائی کرنے لگی۔ کچن کے سارے برتن از سرِ نو صاف کیے۔ دیکھا دیکھی میں نے بھی پہلی مرتبہ برت رکھ لیا جس کا انجام یہ ہوا کہ ماں کو پورے دن میری چنتا لگی رہی۔ وہ بار بار مجھے میوہ جات، ساگودانہ اور سنگھاڑے کے آٹے سے بنے ہوئے پکوڑے کھلاتی رہی۔ بہر حال تسلی اس بات کی تھی کہ دن میں ایک بار کھانا کھانے کی اجازت ہوتی ہے۔

دوپہر میں کھانا کھانے سے پہلے کوؤں کے لیے چھت پر کھانا رکھا گیا۔ پتا جی نے دو سوکھی لکڑیوں اور دھان کے سوکھے گھاس سے ایک چلیپا نما شے 'کاوپوتل' بنا لیا جس کے جوڑ پر گھاس کی ایک چوڑی سی پرچ بُنی گئی۔ پھر اس پر پکے ہوئے چاول اور سبزیاں رکھی گئیں۔ پوجا پاٹ کے بعد پتا جی چھت پر چڑھ گئے اور چلیپا کو مشرق کی جانب افقی سمت میں یوں باندھ لیا جیسے کوئی ہوائی جہاز اُڑنے کو تیار ہو۔ یہ کوشش کی گئی کہ کوؤں کی نظر اس پر آسانی سے پڑ سکے اور وہ شکم سیر ہو جائیں۔ پھر پتا جی کوؤں کو بُلانے کے لیے یہ کشمیری گیت زور زور سے گانے لگے۔

کاوٗ بٹہٕ کاوٗ وا/ کھتٕر رے کاوٗ وا/ کاوٗ تہٕ کاونٕز ساٗتی ہیتھ/ گنگہٕ بلہٕ شرانا کرِتھ/

گرٹی میژِ ٹھوکاہ کرِتھ/ وولہٕ باسانے نوٚے لرِ کُن/ وٗرِ دٕ بتہٕ کھے

(کوے، میرے پیارے کوے/ کھچڑی کھانے والے کوے/ دونوں کوے اور کوی ساتھ میں/ گنگہ بل کے تیرتھ ستھان پر نہا دھو کے/ پیلی مٹی سے ٹیکا لگا کر/ آجاؤ، ہمارے نئے مکان پر/ اور تیل میں پکے ہوئے چاول کھالو)

ہم سب جو ساتھ میں کھڑے تھے، پتا جی کے ساتھ گانے لگے۔ آناً فاناً نہ جانے کہاں سے بیسیوں کالے کوّے چاول پر ٹوٹ پڑے۔ پہلے میں، پہلے میں کے چکّر میں وہ ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ کتنا حسین سماں تھا۔ سبھی بچے ان کوؤں کو دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ مارچ کے وسط میں شوراتری آتے ہی سردیاں ختم ہونے لگیں اور پھر

ایک بھی کالا کوّا نظر نہیں آیا۔ وہ ہزاروں میلوں کا فاصلہ طے کر کے اپنے وطن لوٹ چکے تھے۔ میں کئی بار سوچتا رہا کہ قدرت نے ان کالے کوّوں پر کتنا ظلم کیا ہے۔ وہ دوسرے کوّوں کی طرح ایک ہی جگہ کیوں نہیں رہ سکتے؟ کیوں ان کو بھوک مٹانے اور جان بچانے کے لیے ہر سال اتنی مسافت طے کرنا پڑتی ہے؟ ہجرت کی صعوبتیں اٹھانا کیا ان جانوروں کا مقدر بن چکا ہے؟ مجھے ان کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ شاید میرے بزرگوں کو بھی ان پر ترس آیا ہوگا۔ تبھی تو انھوں نے یہ رسم شروع کی تھی۔

جونہی کیلاش پنڈت نے اپنی کہانی ختم کرلی اس کے پوتے نے سوال کیا۔ ''دادو، انسان کوان کوّوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ کیوں نہیں جانا پڑتا ہے؟''

''انسان چونکہ ضبطِ حرارتی جانور ہے اور ہر موسم میں اپنی حرارت قائم رکھتا ہے، اس لیے موسموں کے بدلاؤ کے باعث اسے اپنی رہائش تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' دادا نے جواب دیا۔

''پھر یہ امیر لوگ اور حکومت کے افسر سردیوں میں جموں اور گرمیوں میں کشمیر نقل مکانی کیوں کرتے ہیں؟'' پوتے نے پھر سوال داغا۔

''انگریزوں اور راجے مہاراجوں کے چونچلے ہیں بیٹے۔ عیش و عشرت کی خاطر اور میدانی علاقوں کی گرمی سے بچنے کے لیے انھوں نے کشمیر، مسوری اور نینی تال جیسے پہاڑی مقامات کو گرمیوں کا ٹھکانا بنالیا جبکہ سردیوں میں واپس میدانی علاقوں میں چلے آتے تھے۔ غریب عوام تو سال بھر ایک ہی جگہ رہتی ہے اور گرمی سردی سب کچھ جھیلتی ہے۔''

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ انسان کو کبھی بھی ہجرت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔'' پوتے نے معصومیت بھرے تجسس سے پوچھ لیا۔

''ایسا نہیں ہے بیٹے۔ انسان بھی ہجرتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پیٹ کی خاطر....!

تحفظ کی خاطر....! مذہب کی خاطر....! یہ تو اس کی بیھی وراثت ہے۔ روزگار کی خاطر ہزاروں لاکھوں لوگ اپنی جڑوں سے اکھڑ جاتے ہیں۔ کئی کسانوں کو کام کرنے کے لیے شہر جانا پڑتا ہے۔ وہ صرف بوائی اور فصل کاٹنے کے سمئے گاؤں لوٹ آتے ہیں۔ زلزلے، سیلاب اور سوکھے جیسے قدرتی حادثات کے سبب لوگوں کو عارضی طور پر اپنی دھرتی چھوڑنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ مگر بعض اوقات انسان کی ہجرتیں مستقل ہوتی ہیں۔ جنگ و جدل، تسخیر کی جبلت، مذہبی جنون اور قدرتی وسائل کی تحریص ان ہجرتوں کا سبب بنتے ہیں۔ اور پھر کبھی کبھی انسان ایسی تخریبی حرکتیں کرتا ہے جن کا گماں بھی نہیں ہوتا۔

بیٹے، ہمیں بھی پچیس برس پہلے انسانی انتہا پسندی کے باعث وادی سے باہر ہجرت کرنا پڑی۔ چونکہ ہماری آبادی آٹے میں نمک کے برابر تھی اس لیے ہم نے وادی کو خیرباد کہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ وہاں رہے ہوتے تو شاید اب تک نیست و نابود ہو چکے ہوتے۔ تھے بھی کتنے؟ تین چار لاکھ ہی کی تو آبادی تھی۔ جس کے جہاں سینگ سمائے وہاں جا بسا۔ یہاں نہ تو وہ سردیاں ہیں اور نہ ہی کالے کوؤں کے جھنڈ۔ تاہم ہم لوگ روایت کے مطابق یہاں بھی کاگ پورنیما مناتے ہیں۔ برت رکھتے ہیں۔ البتہ کاوپوتل نہیں بناتے بلکہ چاول اور سبزیاں پلیٹوں میں سجا کر اوپر چھت کی دیوار پر رکھ دیتے ہیں۔ کہیں کوئی کالا کوا بھولے سے بھی نہیں آٹپکتا۔ دوسرے پرندے آکر شکم سیر ہو جاتے ہیں۔"

کیلاش پنڈت فکر و تردّد کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ پھر وہ جذبات کی رو میں بہہ کر دوبارہ گویا ہوا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ کوؤں کو ہمارا انتظار رہتا ہوگا جیسے ہمیں ان کا انتظار رہتا ہے۔ ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ کائیں کائیں کرتے ہوئے ایک چھت سے دوسرے چھت پر پھدکتے رہتے ہوں گے کہ شاید کسی نے چلیپے پر ان کے لیے کھانا رکھا ہوگا۔ انھیں کون خبر دے گا کہ

ہم ان کا انتظار وہاں نہیں بلکہ یہاں کرتے ہیں۔کون جانے وہ اب بھی اسی انہماک سے آتے ہوں گے یا نہیں؟''

کیلاش پنڈت کی آنکھیں نم ہو گئیں۔اس کا پوتا یہ دیکھ کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ دادو کو ایسے مواقع پر کسی کی موجودگی اچھی نہیں لگتی۔وہ اس اذیت سے اکیلے ہی برسرپیکار ہونا پسند کرتے ہیں۔

گذشتہ چند سالوں سے کیلاش پنڈت کا کنبہ دِلّی کی شدید گرمی سے بچنے کے لیے ہر سال پندرہ بیس روز کے لیے کشمیر جاتا ہے۔بالکل ان کووّں کی مانند جو قطبی علاقے کی یخ بستہ ٹھنڈ سے بچنے کے لیے سردیوں میں کشمیر کا رخ کرتے ہیں۔ٹورسٹ سینٹر، ایئر پورٹ، ہوٹل، ڈل جھیل، گلمرگ، پہلگام غرض سبھی سیاحتی مراکز پر لوگ ان کے استقبال کے لیے منتظر رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ان کی میزبانی قبول کریں۔کئی بزرگ لوگ ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جن دنوں کیلاش پنڈت اسی کلچر کا حصہ تھا۔دونوں طرف آنسوؤں سے نم آنکھیں خاموشی سے سارا ماجرا بیان کرتی ہیں۔

پچھلے برس کیلاش پنڈت کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اپنا آبائی مکان دیکھنے کی ضد کرنے لگا۔اسے اندیشہ تھا کہ اب چل چلاؤ کی گھڑی نزدیک آرہی ہے۔مرنے سے پہلے کم سے کم ایک بار اس مسکن کا دیدار تو کرلے جس میں اس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی گزری تھی حالانکہ آخری عمر میں اس کی جدائی جھیلنی پڑی تھی۔

وہاں تو مکان کی ہیئت ہی بدل چکی تھی۔وہ جو چھوڑ کر چلا گیا تھا اب کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔کیلاش پنڈت کے لیے وقت اسی دم رک گیا تھا جب وہ نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔اسے یہ احساس ہی نہ تھا کہ وقت کسی کے لیے نہیں رکتا، اپنی رفتار سے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس نے جتنا بھی تھوڑا وقت وہاں گزارا، اس دوران وہ اپنے ذہن کے پردے پر اپنے چھوڑے

ہوئے مکان کی تخیلی تصویریں بناتا رہا۔

''بالکل سامنے میرا پڑھائی کا کمرہ تھا جہاں کھڑکی پر بیٹھ کر میں فلمی گانے گنگناتا تھا اور گلی کے اس پار سامنے والی کھڑکی میں روپا رہتی تھی جو پلک جھپکتے ہی کھڑکی پر آ جاتی تھی۔ کیا معلوم کہاں ہوگی؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟ اسے دیکھے زمانہ ہو گیا۔ کمرے کے نیچے ہمارا کچن تھا جہاں صبح ہوتے ہی برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ دوسری جانب بڑا سا کمرہ تھا جہاں مہمان آکر بیٹھتے تھے۔ اسی کے اوپر والدین کا کمرہ تھا۔ سردیوں کا موسم یوں ہی تیوہاروں میں نکل جاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک چلے آتے تھے۔ اور جب کاگ پورنیما ہوتی ہم کوؤں کا سواگت کرتے، ان کے لیے برت رکھتے، پوجا کر کے چلپسے پر چاول اور سبزی رکھتے اور پھر اسے اوپر چھت پر رکھ دیتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالے کوؤں کا ہجوم عرش سے اتر آتا۔''

کیلاش پنڈت کا جی چاہا کہ چھت کے اس حصے کو دیکھ لے جہاں اس کے پتا جی کوؤں کے لیے کاؤ پوتُل باندھتے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کو اپنی حماقت پر ہنسی آئی۔

مکان مالک کو احساس ہوا کہ کیلاش پنڈت کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے رہا نہ گیا۔ اس لیے پوچھ بیٹھا۔

''کیلاش صاحب، آپ کچھ ڈھونڈ رہے ہیں۔ مکان چھوڑتے وقت کیا کوئی قیمتی شے چھوٹ گئی تھی؟''

''نہیں بھائی صاحب، میں اپنا بچپن ڈھونڈ رہا ہوں۔ یہیں کہیں کھو گیا ہے۔ وہ اب کہاں مل سکتا ہے۔''

اس کے بعد وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ پوتے نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور باہر کھڑی کار تک سہارا دے دیا۔

☆☆☆☆☆

بستے کا بوجھ

''ڈیڈی، میرا بستہ اٹھا لیجیے۔ بہت بھاری ہے۔''

شایستہ نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر سکول کا بستہ میرے حوالے کر دیا۔ اس روز ہم خود ہی شایستہ کو گھر لانے کے لیے اس کے سکول گئے تھے ورنہ وہ ہر روز کی طرح بس میں چلی آتی۔ جزدان اتنا بھاری تھا کہ میرے شانے دکھنے لگے۔ کار تک پہنچنے کے لیے میں کندھے بدلتا رہا۔ پھر سوچنے لگا کہ بستہ اٹھا کر میرا یہ حال ہو رہا ہے، بیچاری شایستہ کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ بستے کے وزن کا احساس مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ مصروفیات ایک بزنس مین کو زندگی کے دوسرے شعبوں پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں دیتیں۔

مجھے وہ گھڑی یاد آ رہی تھی جب ہمارا ملک آزاد ہوا۔ میرے کھدر پوش والد خوشی سے جھوم اُٹھے تھے۔ سرکاری سکول کی ہیڈ ماسٹری کر کے ان کی عمر گزر چکی تھی۔ میں نے ان کو کئی بار یہ کہتے سنا تھا کہ اس دیش کو نئی سوچ و فکر کی ضرورت ہے۔ لارڈ میکالے نے اپنی زبان تھوپ کر انگریزی خواندہ کلرکوں کی فوج تیار کر لی تا کہ اس ملک پر فرنگی حکومت کی گرفت مضبوط ہو سکے اور ہم اپنی تہذیب و تمدن سے محروم ہو جائیں۔ ابو خوش نصیب تھے کہ انھوں نے سوراج ملنے کے بعد وہ سب تباہی نہیں دیکھی جو ہم نے سودیشی رہنماؤں کی کارستانیوں کی بدولت دیکھ لی۔ اقتدار ملتے ہی سب بندر بانٹ میں لگ گئے اور وقت کا پہیہ انگریزوں کے معینہ محور ہی پر گھومتا رہا۔ یہ دیسی حکمران کب چاہتے کہ ان کے بچوں کو مل رہی آسائشیں اور سہولتیں کوئی اور چھین لے۔ ان کے بچے بدستور مشنری اور پبلک سکولوں میں تعلیم پاتے رہے جبکہ سرکاری سکولوں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی رہی

۔غریبوں کے بچے ان خستہ حال سکولوں میں تعلیم پانے کے لیے مجبور ہو گئے ۔انجام کار فرنگی بود و باش کے ناقل، مشنری اور پبلک سکولوں میں تربیت یافتہ، غلامی ذہنیت کے روبوٹ گگرمتوں کی طرح جہاں تہاں پھوٹتے چلے گئے ۔کئی تعلیمی کمیشن بٹھائے گئے، بے شمار رپورٹیں محافظ خانوں میں دھول اور مٹی کھاتی رہیں، آئے دن کانفرنسیں اور سیمنار ہوتے رہے مگر کہیں کوئی بنیادی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔

گھر پہنچ کر میں نے بیٹی کا سکول بیگ کھول کر دیکھ لیا۔نویں جماعت میں کتنی ساری کتابیں بیگ میں ٹھونس رکھی تھیں۔ پوچھا تو اس نے درجن بھر مضامین کے نام گنوا دیے۔

''کیا تم ہر روز یہ سب مضامین پڑھتے ہو؟ اور پھر یہ دو دو کاپیاں کس لیے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ڈیڈی۔ایک کلاس ورک کے لیے اور دوسری ہوم ورک کے لیے۔میڈم کا آرڈر ہے کہ ہر روز سبھی کتابیں اور کاپیاں لایا کرو۔'' شایستہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے باپ کو آج کیا ہو گیا ہے کہ طرح طرح کے سوال کیے جا رہے ہیں۔پہلے تو انھیں یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا کہ میں کس جماعت میں پڑھتی ہوں۔

''اللہ رحم!....ان بچوں پر رحم کر لے۔'' میرے دل سے دعا نکلی۔''یہ نسل تو کتابوں کے بوجھ تلے دب چکی ہے۔کھیل کود اور سیر و تفریح کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔تھوڑا بہت وقت مل بھی گیا تو بند کمروں میں بیٹھ کر کمپیوٹر اور ویڈیو گیمز کھیلنے لگ جاتے ہیں۔''

''شایستہ کا فیس بھرنا ہے۔سکول والوں نے دو بار اس کی ڈائری پر نوٹ لکھ کر بھیج دیا ہے۔'' نائیلہ، جس نے اپنی بیٹی کی تعلیم کا بیڑہ اٹھا لیا تھا، بیچ میں بول اٹھی۔''آپ چھتیس ہزار کا چیک کاٹ کر رکھ لیجیے، میں کل جا کر خود ہی جمع کر کے آؤں گی۔''

''چھتیس ہزار.......!''

''جی ہاں، چھتیس ہزار..... پڑھائی مفت میں نہیں ہوتی۔ آپ کو کسی چیز کی کبھی فکر ہی نہیں رہتی پھر کیسے معلوم ہوگا۔ ایڈمشن، فیس، وردی، کتابیں......... آپ نے اس بارے میں کبھی پوچھا بھی.....؟ ایڈمشن کے وقت سکول والے ڈیڑھ لاکھ لے گئے تھے۔ مہینے کی فیس چھ ہزار ہوتی ہے۔ اگلے چھ ماہ کی فیس جمع کرنی ہے۔''

''روپے نہ ہوئے کوڑیاں ہوگئیں۔ اس سے بہتر تو ہم لوگ تھے۔ سرکاری سکول میں تعلیم حاصل کی تھی میں نے۔ ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے مہاراجہ نے ساری ریاست میں جبری سکول کھلوائے تھے جہاں بچوں کو جبراً مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ انٹرنیشنل ریڈ کراس سوسائٹی کی طرف سے ہفتے میں ایک بار خشک دودھ بانٹا جاتا تھا جس سے گھر والے نمکین چائے بنایا کرتے تھے۔ پڑھائی کا معیار بہت اچھا ہوتا تھا۔ استاد بھی خلوص اور ایثار کے پیکر ہوتے تھے۔ میرے کئی ہم جماعتی بڑے بڑے عہدوں پر براجمان ہیں۔ کچھ ایک تو مغربی ممالک میں ڈاکٹر اور انجینئر ہیں۔''

''آپ کا زمانہ الگ تھا۔ وہ باتیں اب کہاں! سکولوں میں ایڈمشن کے لیے اتنی مارا ماری ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ کئی سکولوں میں داخلے کے لیے منسٹروں کی سفارش لانی پڑتی ہے۔'' نائیلہ نے جواب دیا۔

''ڈیڈی، یہ سکول والے پاگل ہیں۔ کہتے ہیں تین زبانیں سیکھ لینا ضروری ہے۔ بھلا ہمیں اتنی ساری زبانیں سیکھ کر کیا کرنا ہے؟'' شایستہ نے ماں کی بات کاٹ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

''بیٹے، زبانیں سیکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ آگے چل کر کام آئیں گی۔'' میرے اندر سویا ہوا ادیب جاگ اٹھا۔

''وہاٹ! ڈیڈی... آپ بھی نا....! میں سائنس سٹوڈنٹ ہوں، کوئی زبان داں نہیں۔

مجھے زبانوں سے کیا لینا دینا؟ میرا کام تو صرف انگریزی سے چل جائے گا۔ انٹرنیٹ، کمیونکیشن، سائنس، ٹکنالوجی۔ یہ سب انگریزی کی وساطت سے ممکن ہے۔"

"بیٹے، انگریزی کے علاوہ تمھیں دو اور زبانوں میں پاس ہونا پڑے گا۔ ایسا سرکار کا آرڈر ہے۔" میں نے نصیحت کی۔

"پاس تو خیر ہو ہی جائیں گے۔ سکول میں اتنی زبانیں سیکھنے کے لیے ٹیچرس کہاں ہیں؟ لنگوئج ٹیچر امتحان میں مدد کرتی ہیں۔ اس کو معلوم ہے کہ اس کی نوکری کا دارومدار شرح کامیابی پر ہے۔"

چھوٹی سی بچی کتنی بڑی بات کہہ گئی۔ چند روز پہلے ہی میں نے خبر پڑھ لی تھی کہ اتر پردیش میں ساٹھ فیصد اردو اساتذہ کی اسامیاں خالی پڑی ہیں، پھر سکولوں میں اردو زبان کون سکھاتا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد شایستہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور نائیلہ کچن میں گھس گئی۔ میں وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور فکر و تردّد کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ بہت عرصہ پہلے بچوں کے نصاب سے متعلق کسی سیمنار کی رپورٹ کی تفصیلات اخبار میں شائع ہوئی تھیں جس میں ملک کے کئی نامور ماہرینِ تعلیم نے طرح طرح کی تجاویز پیش کی تھیں۔ ماہرِ ماحولیات نے اوزون کی کمی، سموگ، نیوکلیائی فضلہ، پانی کی آلودگی، بھوپال ٹریجڈی اور پولی تھین کے بے تحاشہ استعمال کی جانب اشارہ کرکے اس بات پر زور دیا تھا کہ نصاب میں ماحولیات کا مضمون الگ سے پڑھایا جانا چاہیے۔ ماہرِ حیوانیات نے انسانی غارت گری کے سبب جنگلی پرندو چرند اور پیڑ پودوں کی گرتی ہوئی آبادی کا حوالہ دے کر تجویز کی تھی کہ علم حیاتیات نصاب میں شامل ہونا چاہیے۔ ادھر ماہر کمپیوٹر نے موڈرن ٹکنالوجی کے مدنظر بچوں کے نصاب میں کمپیوٹر سائنس کی اہمیت کو اجاگر کیا تھا۔ سب سے زیادہ بحث اس بات پر ہوئی تھی کہ بچوں کو کس زبان میں تعلیم دی جائے۔ گاندھیائی نظریے کے حامی چاہتے تھے کہ بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم پائیں۔ لبرل

انٹلکچول انگریزی کے حق میں تھے جبکہ ہندو بدھ جیوی اس بات پر زور دے رہے تھے کہ ہندی تو قومی زبان ہے ہی اس کے ساتھ سکولوں میں سنسکرت بھی پڑھائی جانی چاہیے تا کہ بچے اپنی قدیم تہذیب اور روایت سے نابلد نہ رہیں۔ اس کے برعکس مسلمان دانشور اردو، فارسی اور عربی کی حق تلفی کی دہائی دے رہے تھے۔ ایک اور جانب علاقائی زبانوں کے ماہرین نے اپنی اپنی زبانوں کی بلند بانگ پیروی کی تھی۔ ان کا بس چلتا تو ہندوستان کو بابل کا مینار بنا کر چھوڑ دیتے جہاں ہر کوئی اپنی اپنی راگنی الاپنا چاہے دوسرا آدمی اس کی بولی سمجھے یا نہ سمجھے۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا تھا کہ بچوں کو تین زبانیں، مادری، قومی اور غیر علاقائی، سیکھنا ضروری ہوگا۔ اس وقت میں نے اس رپورٹ پر زیادہ غور نہیں کیا تھا مگر آج اس کا انجام میری آنکھوں کے سامنے تھا اس لیے حیران تھا۔ مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ بلوریں ایوانوں میں رہنے والے یہ انٹلکچول بچوں کی نشو ونما کی بجائے ان کو ہونق بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اس کے بعد وقت کیسے گزرا پتا ہی نہ چلا۔ شایستہ نے انجینئرنگ مکمل کی اور انٹرنیٹ کی مدد سے بائیوٹکنالوجی میں ایم ایس کرنے کے لیے جرمن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اس نے اپنی پڑھائی کے اخراجات کے لیے خود ہی بنک سے لون کا بندوبست بھی کیا۔ مجھے بس گارنٹی دینا پڑی۔ حیرت اس بات کی ہو رہی تھی کہ میری رہنمائی کی اسے کہیں ضرورت ہی نہ پڑی۔ پھر میں خود ہی سوچنے لگا کہ ایک ادنیٰ سا تاجر آخر اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ میں تو عمر بھر منڈی کی تیزی اور مندی کے درمیان جھولتا رہا۔ دنیا بادِ صرصر کی مانند میرے پہلو سے گزرتی چلی گئی اور مجھے اس کا پتہ بھی نہ چلا۔ مجھے اپنا آپ اس کنویں کے مینڈک سا لگ رہا تھا جسے یہ گماں ہوتا ہے کہ اسے ہر بحر اعظم کے مدّ و جزر کی واقفیت ہے۔ ہم جیسے لوگ اپنے بچوں کو کوئی قدم اٹھانے سے پہلے صرف خبردار اور تنبیہ کرنا جانتے ہیں جب کہ سچ یہ ہے کہ ہمیں خود اگلی منزل کا علم نہیں ہوتا۔

جرمنی سے شایستہ ای میل کے ذریعے اپنے روزمرہ کی جانکاری دیتی رہی۔ قریب دس

گیارہ مہینے گزر جانے کے بعد اس کی جوابی میل موصول ہوئی اس میں لکھا تھا کہ "میری سیکھی ہوئی تینوں زبانیں یہاں کسی کام کی نہیں۔ اس ملک میں انگریزی کے بدلے جرمن زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ خیر میں نے جوں توں کر کے سیکھ ہی لی اور اب خوب پڑھ لکھ لیتی ہوں۔ یہاں کا تعلیمی نظام مختلف ہے۔ بچوں کے بستے ہلکے ہوتے ہیں۔ انھیں فضول کتابوں کا بوجھ ڈھونا نہیں پڑتا۔ دن کیسے گزر جاتا ہے کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میری زندگی کلاس اور لائبریری کے درمیان جھول کر رہ گئی ہے۔ مالی حالات کے مدنظر رات کو ایک ریستوراں میں ویٹریس کا کام کرتی ہوں تا کہ اخراجات کی کچھ تو بھرپائی ہو سکے اور پھر بنک قرضے کی فکر بھی تو لاحق رہتی ہے۔"

ای میل پڑھ کر میں عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ ذہن میں کئی سوالات ابھرے۔ "میری بیٹی اور ریستوراں میں ویٹریس کا کام کرے....! اس کا تو مجھے گماں بھی نہ تھا۔ اسے دن رات محنت کرنی پڑتی ہے، نہ جانے صحت کا کیا حال ہوگا؟ لوگ سوچتے ہیں کہ آدمی دولت کمانے اور آرام کی زندگی بسر کرنے کے لیے غیر ممالک کا رُخ کرتا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ ان آسائشوں کو پانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"

شایستہ نے اپنی تعلیم مکمل کی اور اس کے بعد انسان کے مصنوعی اعضا بنانے والی ایک جرمن کمپنی میں ملازمت اختیار کی۔ وہ مصنوعی قلبی والو بنانے کے پروجیکٹ سے جڑ گئی۔ کام چنوتی بھرا تھا مگر شایستہ کو اس میں اپنا روشن مستقبل دکھائی دیا۔ کہتے ہیں دکھن گئے نہ با ہورے، رہے چندیری چھاؤ۔ غرض یہ کہ ہماری اکلوتی بیٹی کے گھر لوٹنے کا اب کوئی امکان نہ تھا۔

وہ اس اجنبی شہر میں اپنی تنہائیوں کے ساتھ جوجھتی رہی اور اس کشاکشی اور مالی تنگدستی کی وجہ سے اس نے ایک ہم عمر اور ہم پیشہ دوست کا انتخاب کیا جو اسی کی طرح راولپنڈی سے جرمنی گیا تھا۔ کرایے کے بار کو کم کرنے کے لیے دونوں ایک ساتھ لِو ان ریلیشن شپ میں رہنے لگے۔ مجھے اس بات کا علم تب ہوا جب دونوں کرسمس کی چھٹیوں کے دوران ہندوستان آئے اور ہم سے شادی

کرنے کی اجازت مانگنے لگے۔ یہ تو خیر رسم نبھانے والی بات تھی، شادی کا فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر کے آئے تھے۔ میں اور نائیلہ انھیں بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ کتنا حسین جوڑا تھا۔ نائیلہ نے جلدی سے دونوں کی نظر اتار لی۔ کاشف ہوٹل میں ٹھہرا جبکہ شایستہ اپنے گھر میں رہی جب تک دونوں کا باضابطہ نکاح ہوا۔ کاشف کے چند رشتے دار بھی سرحد پار سے شادی میں شریک ہونے کے لیے آئے۔ فریقین کے طور طریقے یکساں تھے۔ کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہی رواج، وہی رسمیں، وہی لباس، وہی پکوان۔ بس دونوں کے بیچ ایک مصنوعی لکیر تھی جو انھیں الگ رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

نکاح کر کے کاشف اور شایستہ جرمنی چلے گئے۔ حالانکہ انٹرنیٹ اور موبائیل سے رابطہ بدستور جاری رہا لیکن مجھے اور نائیلہ کو ڈھلتی عمر اور اکیلے پن کا احساس ستانے لگا۔ کبھی کبھی وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''دیکھو، اب میرے جانے کا وقت آچکا ہے، تم اکیلے رہ جاؤ گے۔ پھر تمھاری دیکھ بھال کون کرے گا؟ میرے بغیر کیسے جی سکو گے تم؟''

ایسے موقعوں پر میں اس کے دل کی زبان سمجھ لیتا اور میری خاموشیاں بول اُٹھتیں۔ ''نائیلہ، تم ساری عمر انسانوں سے بھرے اس جزدان کا بوجھ اٹھاتی پھرتی رہی۔ مجھے اور شایستہ کو کسی بات کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تمھارا بوجھ کون اٹھائے گا؟ شایستہ تو آنے سے رہی۔ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس نے اپنے لیے ایک نئے بقچے کا بندوبست کر لیا ہے۔ شوہر ہے، ایک بیٹا ہے اور دو بیٹیاں ہیں جو جرمنی میں ہی سکول جاتے ہیں۔ پھر بھلا وہ انھیں چھوڑ کر کیسے چلی آئے گی۔''

ہم دونوں ایک دوسرے کو لمبی عمر کی دعائیں نہیں دیتے بلکہ اٹھتے بیٹھتے یہی دعا کرتے ہیں کہ خدایا اگر ہم نے کبھی بھی کوئی بھی کارِ ثواب کیا ہو تو اس کے صدقے ہم دونوں کو ایک ہی ساتھ اپنے پاس بلا لینا۔

☆☆☆☆☆

ڈاگ ہاؤس

مجھے بچپن ہی سے جانور پالنے سے سخت نفرت تھی۔ بات یوں ہے کہ میں نے آٹھویں جماعت میں ایک انگریزی کہانی 'سب سے بہتر آزادی' (Freedom Above All) پڑھی تھی جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کہانی میں ایک جنگلی بھیڑیے اور ایک پالتو کُتّے کی دوستی ہو جاتی ہے۔ کُتّے کو زندگی کی تمام تر آسائشیں اور سہولتیں میسر ہیں اس لیے وہ ہر دم ان کا بکھان کرتا رہتا ہے۔ کئی بار اس نے اپنے دوست سے کہا۔

''یار تمھاری زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ گھر نہ ٹھکانہ۔ جنگلوں میں دربدر بھٹکتے رہتے ہو۔ پیٹ بھرنے کے لیے مارے مارے پھرتے ہو۔ میری طرف دیکھو۔ خدا نے سب کچھ دے دیا ہے۔ میرا مالک بہت ہی امیر، نیک اور رحم دل آدمی ہے۔ میرے لیے ہر روز ہڈیوں والا گوشت منگواتا ہے۔ ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں آرام دہ بستر پر سلاتا ہے۔ روزانہ مجھے نہلاتا ہے۔ میرے بالوں پر طرح طرح کے پاؤڈر ڈالتا ہے۔ بیمار ہو جاؤں تو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کے عوض مجھے صرف رات بھر پہرے داری کرنی پڑتی ہے تا کہ اس کی جان و مال کی حفاظت ہو۔ اتنی تھوڑی سی محنت کرنے میں کوئی حرج تو ہے نہیں۔''

''تم سچ کہتے ہو دوست، تمھاری باتیں سن کر مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ تمھیں تو دنیا کی سبھی نعمتیں دستیاب ہیں جبکہ مجھے جینے کے لالے پڑے ہیں۔ پیٹ بھرنے کے لیے خود ہی شکار کی تلاش میں جانا پڑتا ہے۔ کبھی کبھار جب کسی ریوڑ سے بچھڑی بھیڑ یا بکری دیکھ لیتا ہوں تو فوراً اس پر جھپٹتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ چرواہے یا اس کے شکاری کتوں کی نظر مجھ پر پڑتی ہے اور وہ

میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں۔ آج تک جیسے تیسے میں نے خود کو ان کے چنگل سے بچالیا لیکن آگے کی خدا جانے۔''

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ تم بھی میری طرح کسی مالک سے وفاداری کرنا سیکھو تا کہ زندگی آرام سے کٹ جائے۔''

''تمہارا مشورہ معقول ہے....'' بھیڑیا تذبذب میں پڑ گیا مگر اچانک اس کی نظر کُتّے کی گردن میں پھنسے طوق پر پڑی۔ وہ استفسار کرنے لگا۔ ''یار، تمھارے گلے میں یہ پٹا کس لیے بندھا ہے؟''

''اسے کالر کہتے ہیں۔ یہ میرے مالک نے پہنایا ہے۔ یوں تو میں گھر کے سبھی افراد سے مانوس ہو چکا ہوں اور گھر کی چار دیواری میں کھلا پھرتا رہتا ہوں تاہم گھر میں جب کبھی کوئی مہمان آتا ہے یا پھر مالک مجھے سیر کرانے کے لیے باہر لے جاتا ہے تو اس کالر اور زنجیر کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''مطلب یہ کہ تم اپنی مرضی سے جی نہیں سکتے۔ یہ کالر تمہاری گردن میں اس لیے ڈالا گیا ہے کہ تم اپنے مالک کے اشاروں پر زندگی بسر کرو۔ نہیں بابا نہیں، یہ تو غلامی کی نشانی ہے۔ مجھے اپنی آزادی زیادہ پیاری ہے چاہے وہ کتنی ہی جوکھم بھری کیوں نہ ہو۔''

اس کہانی کو پڑھنے کے بعد میں نے جانوروں کو پالتو بنا کر گھر میں قید کرنے سے توبہ کر لی۔ کہیں کسی پنجرے میں توتے یا مینا کو گرفتار دیکھتا تو مجھے کوفت ہو جاتی۔ اسی طرح زنجیروں میں بند کتوں کو دیکھ کر مجھے ان پر رحم آتا۔ البتہ ڈھلتی عمر میں بچوں کے سامنے کب کسی کی چلتی ہے۔ ایک روز میں اپنے بیٹے کو اکیلا چھوڑ کر دفتری کام سے ہفتہ بھر کے لیے دورے پر چلا گیا۔ موقع غنیمت جان کر وہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کسی نزدیکی پہاڑی مقام پر پکنک منانے چلا گیا۔ واپسی پر انھوں نے کسی حلوائی کے پاس کار روک لی اور چائے پینے بیٹھ گئے۔ گرل فرینڈ کی نظر حلوائی کی کتیا پر پڑی

جس نے چند روز پہلے ہی چھ بچے جنے تھے۔ اس کا جی للچایا۔ فوراً اپنے بوائے فرینڈ سے فرمائش کی۔ ''دیکھو تو کتنے پیارے پیارے پپیز ہیں۔ تمھارے پاس اتنا بڑا مکان ہے۔ پھر کیوں نہ اس حلوائی سے ایک پپ مانگ لیں اور گھر میں پالیں۔''

حالانکہ میرے بیٹے کو اس بات کا احساس تھا کہ مجھے گھر میں کتے پالنے سے سخت نفرت ہے پھر بھی وہ اپنی معشوقہ کی بات نہیں ٹال سکا۔ ایک تو فرمائشِ محبوب اور پھر عمر کا تقاضا۔ بے چاری نے چاند تارے لانے کی فرمائش تو کی نہیں تھی بس ایک پلّا پالنے کو کہا تھا۔ اس لیے یہ سوچ کر جلدی راضی ہو گیا کہ پتا جی کو کسی نہ کسی بہانے راضی کر لوں گا۔ حلوائی نے بھی لڑکی کی فرمائش کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح پلّے کو گود میں اٹھائے دونوں خوشی خوشی گھر لوٹے۔

رات گئے میرا موبائیل بجا۔ دوسری طرف میرا بیٹا مسرت اور خوف کے ملے جلے لہجے میں بول رہا تھا۔

''ہیلو پاپا، کیسے ہیں؟ اس وقت آپ کہاں ہیں اور کب تک لوٹ آئیں گے؟''

''تین دن اور لگیں گے۔ کوئی خاص بات؟'' میں نے جواب دیا۔

''پاپا، ہمارے گھر میں ایک نیا مہمان آیا ہے۔'' اس کے لہجے میں انکساری تھی۔

''کیوں، کون آیا ہے؟ مجھے بھی بتاؤ۔''

''میں نے ایک چھوٹا سا پپّی گھر میں پالنے کے لیے لایا ہے۔ بہت اچھی نسل کا ہے پاپا۔ دیکھ لیں گے تو حیران ہو جائیں گے۔ بالکل مفت میں مل گیا۔ کوئی پیسہ نہیں دینا پڑا۔''

''وہاٹ!'' میرا پارا ایک دم چڑھ گیا۔ ''تمھارا دماغ تو نہیں پھر گیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ مجھے ان چیزوں سے سخت نفرت ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ جس سے لیا ہے اس کو واپس دے کر آ جاؤ۔''

''پاپا، وہ یہاں سے دو سو کلو میٹر دور ہے۔ اُدھر دوبارہ جانا مشکل ہے۔ آپ جب پپّی کو

دیکھیں گے تو خود ہی پسند کریں گے۔"

وقت کا پہیہ سچ مچ گھوم چکا تھا۔ جو ہو چکا اس کو بدلنا ممکن نہ تھا۔ نافرمانی کے اس بول نے مجھے یہ احساس کرایا کہ اب میں حاشیے پر براجمان ہوں اس لیے کوئی مزاحمت واجب نہیں۔ میں نے اپنا غصہ تھوکنے کی کوشش کی گو ذہن ابھی بھی مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ رہی بات نسل کی۔ دیکھنے میں تو اچھی نسل کا کتا نظر آرہا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ اسے 'راڈ وھیلر' کہتے ہیں اور اس کے خطرناک رویے کے سبب کئی یورپی ملکوں میں اس نسل کے کتوں کو پالنے کی سخت مناہی ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کے آگے ہتھیار ڈال دیے کیونکہ اس عمر میں کسی احتجاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کتے کا نام 'ٹائیگر' رکھا گیا اور وہ بڑھتے بڑھتے سچ مُچ باگھ کی مانند پھرتیلا اور خونخوار بن گیا۔ کیا مجال کوئی آدمی گھر کے اندر یوں ہی چلا آئے یا پھر مالک کے پاس پھٹکے، اس کی تو شامت آجاتی۔ ٹائیگر جب تک زندہ رہا دس پندرہ لوگوں کو زخمی کر چکا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں ٹائیگر کے ساتھ مانوس ہوتا چلا گیا۔ اب وہ پہلی سی کدورت دل میں نہیں رہ گئی تھی۔ جب بھی میں گھر میں ہوتا وہ میری ٹانگوں کے ساتھ چمٹا بیٹھا رہتا۔ بارہا میرے بستر کے اوپر بھی براجمان ہو جاتا۔ ایسی اپنائیت میں نے انسانوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اب ہمارے کنبے کا فرد بن چکا تھا۔

بہت عرصہ بعد ہمیں ایک قریبی رشتے دار کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے جموں جانا پڑا۔ اس وقت میں ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا اور وہ پرانی ٹھاٹ باٹ باقی نہیں رہی تھی۔ نہ وہ گورنمنٹ کے بنگلے تھے اور نہ ہی وہ سہولتیں۔ ہم نے دہلی کے قریب ایک فلیٹ خریدا تھا جس میں ٹائیگر کو پالنا مشکل ہو رہا تھا۔ جموں جانے اور واپس آنے میں دو دن لگ جاتے جبکہ وہاں بھی تین چار دن کا قیام ضروری تھا۔ میں تردّد میں پڑ گیا کہ ٹائیگر کو کہاں رکھیں؟ اسے خون کا رشتہ نہ سہی لیکن درد کا رشتہ استوار ہو چکا تھا۔ کسی رشتے دار یا دوست کے پاس تو رکھ نہیں سکتے تھے اور نہ ہی ساتھ لے

جانا ممکن تھا۔اس لیے میں نے اپنے بیٹے سے پوچھ لیا۔

''بیٹے شادی میں شرکت کرنا تو ضروری ہے۔اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں ہے۔مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ ٹائیگر کو کہاں رکھ چھوڑیں؟''

''پاپا، آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیوں پریشان ہوتے ہیں؟'' بیٹے کے بجائے اس کی گرل فرینڈ، جواب اس کی بیوی بن چکی تھی، نے ٹوک کر کہا۔''میں گذشتہ تین چار دن سے سوچ رہی تھی کہ آپ کا چہرہ اُترا اُترا سا کیوں لگ رہا ہے۔پاپا یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔''

''کیسے پرابلم نہیں ہے۔تم لوگ اسے چھوٹی بات سمجھتے ہو۔یہ بے زبان کہاں جائے گا؟ گھر میں اکیلا تو رہ نہیں سکتا اور پھر کسی دوسرے کے گھر میں بھی نہیں رکھ سکتے ہیں۔کھانا، پینا اور حاجات ضروریہ......ان سب کا انتظام کیسے ہوگا؟'' میرے لہجے میں خفگی تھی۔

''پاپا، آپ تو دقیانوسی باتیں کرتے ہیں۔آج کل جیب میں پیسہ ہونا چاہیے ہر چیز مل جاتی ہے۔شہروں میں جگہ جگہ 'ڈاگ ہاؤسز' کھل چکے ہیں جن کا انصرام پیشہ ور ویٹرنری ڈاکٹر کرتے ہیں۔ہم ٹائیگر کو کسی قریبی سگ خانہ میں ڈال دیں گے اور جب لوٹیں گے تو واپس گھر لائیں گے۔'' بہو نے تیقن کے ساتھ جواب دیا۔

''ڈاگ ہاؤس...!سگ خانہ...!کیا بولتے ہو! کیا وہاں پر کتوں کی دیکھ بھال ہوتی ہے؟''

''کیوں نہیں، جب چڑیا گھروں میں وحشی جانور پالے جا سکتے ہیں تو پھر سگ خانہ میں پالو کتوں کی دیکھ بھال کیوں نہیں ہو سکتی ہے۔''

جس روز ہمیں جموں جانا تھا اسی روز میرے بیٹے نے ٹائیگر کو 'موڈرن ڈاگ ہاؤس' میں ڈال دیا۔رات کو ہم ریل گاڑی میں بیٹھ کر جموں روانہ ہو گئے۔البتہ مجھے یہ غم ستائے جا رہا تھا کہ نہ جانے ٹائیگر نے کھانا کھایا ہوگا یا نہیں۔اس کی اچھی طرح دیکھ ریکھ ہو رہی ہوگی یا نہیں۔کہیں اس

کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہو رہی ہوگی؟'' اس دن مجھے احساس ہوا کہ پالا پوسا خون کے رشتے سے بھی زیادہ دل کے قریب ہوتا ہے۔

ہفتے بھر کے بعد ہم لوٹ آئے۔ میرے بیٹے نے سب سے پہلے ٹائیگر کو سگ خانہ سے واپس لایا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے بشاشت ہوئی جیسے میں اپنے لخت جگر سے مدتوں بعد مل رہا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر میرے پاؤں کے ساتھ دیوانہ وار لڑھکنیاں کھانے لگا۔ عام والدین کی مانند مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ٹائیگر پہلے سے کافی دبلا ہو چلا ہے۔ میں چپکے سے بازار چلا گیا اور اس کے لیے ہڈیوں والا گوشت لے کر آ گیا۔

اس ابتدائی تجربے کے بعد ٹائیگر کو کئی بار ڈاگ ہاؤس میں رہنا پڑا۔ ہم کبھی تفریح کے لیے پہاڑوں پر چلے جاتے یا پھر کبھی کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے چلے جاتے تو اسے ڈاگ ہاؤس میں چھوڑ جاتے۔

یوں ہی آٹھ سال گزر گئے۔ اب وہ بوڑھا ہو چلا تھا۔ کھانے پینے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب نہ وہ پہلے جیسی پھرتی تھی اور نہ ہی آنکھوں میں وہ چمک۔ ایک روز ہم پھر اسے ڈاگ ہاؤس میں چھوڑ کر پونا چلے گئے۔ تین دن کے بعد ڈاگ ہاؤس کے مالک کا ٹیلی فون آیا کہ ٹائیگر کی صحت بہت بگڑ چکی ہے۔ سفر ادھورا چھوڑ کر ہم سب واپس چلے آئے۔ تین ہی دنوں میں ٹائیگر پنجر بن چکا تھا۔ نہ کچھ کھاتا تھا اور نہ ہی پیتا تھا۔ سپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھایا تو پتا چلا کہ اس کی آنت میں ٹیومر ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے عین مطابق اس کا آپریشن ہوا لیکن ٹائیگر آپریشن ٹیبل سے پھر کبھی زندہ واپس نہیں آیا۔

اس حادثے کو پیش آئے کئی سال بیت گئے۔ گاہ بہ گاہ مجھے ٹائیگر کی بہت یاد آتی رہی۔ اس کی صورت میری آنکھوں کے سامنے بار بار پھر جاتی اور ان میں آنسوؤں کا غبار چھوڑ جاتی۔ وقتاً فوقتاً مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ گھر کے کسی کونے سے اچانک نکل کر آئے گا اور میری ٹانگوں کے

ساتھ لپٹ جائے گا۔ کہیں دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی تو مجھے لگتا کہ وہ مجھے پکار رہا ہے۔

کئی بار میرے بیٹے نے ایک اور کتا لانے کی بات چھیڑی مگر میں نے منع کر دیا۔ ایک تو یہ کہ ٹائیگر کی موت سے میرا دل رنجیدہ ہو چلا تھا اور دوسرے یہ کہ ہم جس فلیٹ میں رہ رہے تھے وہاں انسان قیدی بن کر جی رہے تھے، کتے کی تو بات ہی نہیں۔

وقت گزرنے کا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ یوں بھی صدیاں بے صوت وصدا گزر جاتی ہیں۔ مجھے سبکدوش ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ ضعیف العمری نے مجھے ناکارہ بنا دیا ہے۔ چلنا پھرنا تو دور، اب سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں بچوں پر بوجھ بنتا جا رہا ہوں۔ موت کو جس قدر بلاتا ہوں وہ اتنی ہی دور چلی جا رہی ہے۔

چند روز پہلے بچوں کی سرگوشیاں کانوں میں پڑ گئیں۔ بہو اپنے پتی سے کہہ رہی تھی۔

''بنگلور میں میری بہن کی بیٹی بیاہی جا رہی ہے۔ آنے والی بیس تاریخ کو شادی کی تقریب ہے۔''

''تو پھر....؟'' میرے بیٹے نے پوچھ لیا۔

''ہم سب کو جانا پڑے گا۔ وہ لوگ بھی تو میری شادی پر آ چکے تھے۔ ریل کی ٹکٹیں بک کرنی پڑیں گی۔ چار روز کا سفر ہے اور وہاں چار پانچ دن اور لگ جائیں گے۔ پھر اتنی دور جا رہے ہیں تو آس پاس کی جگہیں۔ میسور، اوٹی اور کوڑائی کنال۔ بچوں کو دکھا کر ہی آئیں گے۔ بار بار تھوڑے ہی جا پائیں گے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس کے لیے پندرہ دن سے کم کیا لگیں گے۔''

''ہاں، میں نے پندرہ دن کا ہی پروگرام بنا لیا ہے۔ مگر ایک پرابلم ہے....'' وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

''رُک کیوں گئی۔ بولو کیا پرابلم ہے؟''

''پاپا کا کیا ہوگا؟'' بہو نے پوچھ لیا۔

''ڈونٹ یو وری۔ یہ کوئی بڑی پرابلم نہیں ہے۔''

''کیا کہتے ہو۔ پاپا تو اب چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ ہم انھیں سنبھال نہیں پاتے، پھر کسی اور کے پاس کیسے رہ سکیں گے؟''

''ارے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہاں پاس ہی میں ایک 'اولڈ ایج ہوم' ہے۔ وہاں فیس دے کر بوڑھے ضعیف لوگوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پندرہ بیس روز کے لیے پاپا کو اسی ورِدھ آشرم میں ڈال دیں گے۔ وہاں کہن سال لوگوں کی بہت ہی سلیقے سے دیکھ بھال کی جاتی ہے۔''

اور پھر وہ مجھے 'سپیشل کیئر اولڈ ایج ہوم' میں چھوڑ کر بنگلور چلے گئے۔

میں جتنے بھی دن اس ورِدھ آشرم میں رہا ہر پل ٹائیگر کو یاد کرتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اس بے زبان نے اپنوں کے بغیر کیسے اس انجانے ڈاگ ہاؤس میں اتنے سارے دن کاٹ لیے ہوں گے؟

☆☆☆☆☆

طلسمی عینک

دوروز پہلے اس کے گیسٹ ہاؤس میں ایک نامور جادوگرسی کے نرولا رہ کر گیا تھا۔خوش قسمتی سے جادوگر کے کرتب اس نے بھی دیکھے تھے۔تماشہ دیکھ کر وہ ایک خیالی اور طلسماتی دنیا میں کھو گیا تھا۔دل چاہتا تھا کہ ہمیشہ ایسی ہی دنیا میں سانسیں لیتا رہے کیونکہ اصلی دنیا سے اس کا جی اُچٹ گیا تھا۔

بدرالدین سرینگر شہر کے پائیں علاقے وازہ پور میں رہتا تھا جہاں کے لوگ طباخی کے ہنر میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں لیکن خود نوالوں کے لیے ترستے ہیں۔یہ بات الگ کہ سرینگر شہر وادیِ کشمیر کا مرکز ہے جو خوبصورتی کے لیے ساری دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔آسماں کو چھوتے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، ہردم کھسکتے یخ بستہ گلیشئر،فرازِ کوہ سے گرتے اور اپنے دامن میں جھاگ کا انبار لگاتے ہوئے آبشار، صاف وشفاف بلوریں جھیلیں، ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی ندیاں، زمین کے بطن سے ابلتے میٹھے پانی کے چشمے اور روح پرور تازہ ہوائیں۔کیا کچھ نہیں ہے اس وادی میں۔ لیکن غربت، معاشی تنگدستی اور اہل خانہ کی بیماریوں کی وجہ سے اس کے لیے یہ سب فضول تھا۔اس کی دنیا میں تو تاریکی ہی تاریکی تھی۔

جس دن نرولا واپس چلا گیا اسی دن بدرالدین نے گیسٹ ہاؤس کے کمروں کی صفائی کروائی مگر فرنیچر اور الماریوں کو خود ہی جھاڑ لیا۔کیا معلوم کس گھڑی دوسرا مہمان آٹپکے۔الماری صاف کرتے وقت اس کی نظر ایک کالے چشمے پر پڑی جو شاید نرولا اپنے ساتھ واپس لے جانا بھول گیا تھا۔بدرالدین نے عینک اٹھائی اور اپنی آنکھوں پر چڑھائی۔پھر جا کر قدِ آدم شیشے میں اپنا چہرہ

دیکھنے لگا۔ سامنے بدرالدین کے بدلے کوئی اور ہی شخص نظر آرہا تھا۔ بالکل فلمی ہیرو جیسا۔ وہ حیران تھا کہ اس کی ایسی حالت کیسے ہوگئی۔ اتنا خوبصورت تو وہ پہلے کبھی دکھائی نہ دیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ خود کو یوں ہی دیکھتا رہے مگر ذہن نے جلدی ٹھوکا دیا کہ ذرا دیکھوں تو یہ حقیقت ہے یا محض آنکھوں کا دھوکا۔ اس نے آنکھوں سے چشمہ اتارلیا اور اپنے آپ کو ٹٹولنے لگا۔ وہاں وہی پرانا بدرالدین تھا۔ دبلا پتلا، سہا سہا، غموں اور تفرقوں سے گھرا ہوا۔ دل کی تسلی کے لیے بدرالدین نے اس کارروائی کو کئی بار دہرایا مگر ہر بار وہی نتیجہ نکلا۔ اسے شک ہوا کہ ہو نہ ہو یہ عینک جادوئی ہے جسے آنکھوں پر چڑھا کر حلیہ بدل جاتا ہے۔

پھر اسے اپنا بچپن یاد آیا۔ سکول میں طلبا اس کو دلیپ کمار کے نام سے پکارتے تھے۔ شکل وصورت، بالوں کا اسٹائل سب کچھ دلیپ کمار جیسا تھا۔ بس ایک کمی تھی اور وہ تھی بول چال کی۔ کشمیری ہونے کے ناتے وہ رواں اور فصیح اردو نہیں بول پاتا تھا حالانکہ اس نے کئی بار دلیپ کمار کی طرح ایکٹنگ کرنے اور مکالمے ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دل میں کئی مرتبہ خیال آیا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فلموں میں کام کرنے کے لیے ممبئی بھاگ جائے مگر اس نے اپنے دوستوں سے بھاگے ہوئے کلاکاروں کی کئی دردناک کہانیاں سن رکھی تھیں اور یہی کہانیاں ہر بار اس کے پاؤں کی بیڑیاں بنتی رہیں۔

بہرحال اسے اتنا تو احساس تھا کہ دنیا میں سبھی اپنا اپنا نصیب لے کر آتے ہیں اس میں کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ کشمیر میں مدھوبالا اور مینا کماری کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین اور مرمریں دوشیزائیں ٹوٹی ٹپکتی چھتوں کے نیچے مسلسل کھانستی ہوئی اور بلغم تھوکتی ہوئی دم توڑتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے بھی اپنی تقدیر کے ساتھ سمجھوتا کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے والد نے سکول چھڑوا کر اس کو سفید چوغہ پہنایا اور طباخی کا ہنر سیکھنے کے واسطے اسے اپنے ساتھ شادیوں میں لے جانے لگا۔ پھر کیا تھا بدرالدین نے فلموں کے خواب دیکھنا چھوڑ دیا۔

بدرالدین نے چپکے سے عینک اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی اور سوچا کہ گھر جا کر اس کا خفیہ طور پر مزید معائنہ کرلوں گا۔ البتہ اسے یہ ڈر ستاتا رہا کہ کہیں یہ عینک بیش قیمتی نہ ہو اور نرولا پولیس میں رپٹ درج نہ کرلے، پھر پولیس اس کو پکڑ کر حراست میں بھر دے گی اور اس کا جینا اجیرن کردے گی۔ پولیس کا کیا انہیں تو غریبوں کو ستائیں دینے اور ان سے پیسہ وصول کرنے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔ مسلمان ہو تو پاکستانی ایجنٹ بتا کر اندر کرلیں گے اور ہندو ہو تو آر ایس ایس کا لیبل لگا دیں گے۔ ہر بار وہی لاٹھیاں، وہی گالی گلوچ، اور وہی مار پیٹ۔ تھانے سے نکل کر آدمی یہ سمجھ نہیں پاتا کہ اس کو کس پاداش کی سزا مل رہی تھی۔ وازہ پور تو اس معاملے میں خاصا بدنام ہے۔

شام کو جب وہ گھر پہنچا تو سیدھے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جالی دار کھڑکی، جس کو مقامی لوگ پنجرہ کہتے ہیں، کھولی اور باہر جھانکنے لگا۔ سامنے لکھوری اینٹوں کے بنے خستہ حال مکان تھے جن کی چھتوں پر بھوج پتر اور مٹی بچھی ہوئی تھی۔ صرف چند ایک مکان ایسے تھے جن پر شنگل یا ٹین کی چادریں بچھی تھیں۔ موسم سرما میں مٹی بچھے چھتوں کی برف چوبی چپّوں اور بیلچوں سے اتاری جاتی تھی۔ جھرجھر دیواروں سے جگہ جگہ مٹی کا پلستر اترا ہوا نظر آرہا تھا۔ گلی کوچوں میں دس سال پہلے ٹائیلیں بچھائی جا چکی تھیں جو اب تک سب کی سب اکھڑ چکی تھیں۔ ہر طرف یا تو گندگی پھیلی ہوئی تھی یا پھر کیچڑ۔ سنٹرل سینیٹری سسٹم کا کہیں کوئی نام ونشان بھی نہ تھا۔ غربت کے باعث لوگ اپنے گھروں میں یہ سسٹم لگانے سے معذور تھے۔ نتیجتاً صبح سویرے پاخانوں کی ساری گندگی کھلی نالیوں میں بہائی جاتی تھی جسے سارا ماحول کثیف اور بدبودار ہو جاتا۔ اُدھر بجلی سال میں چھ مہینے گل رہتی تھی اور اِدھر نلکوں سے پانی غائب ہو جاتا تھا۔ سردیوں میں زندگی کا ٹھپ ہو جانا ضروری امر تھا کیونکہ حاکم، اُمرا اور روساء نقل مکانی کر کے جموں چلے جاتے تھے۔

اس نے پھر سے طلسمی عینک آنکھوں پر لگا دی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے

سامنے عجیب سا منظر تھا۔ بڑے بڑے عالیشان بنگلے جن مین رنگ برنگے قمقمے روشن تھے حالانکہ حکومت ہر روز بجلی کو کم خرچنے پر زور دیتی تھی۔ پس منظر میں پہاڑوں کے سلسلے تھے اور پیش منظر میں مہکتے لالہ زار۔ ان بنگلوں میں دو یا تین آدمیوں سے زیادہ لوگ نہیں رہتے تھے مگر ان کے سائز مکینوں کی فارغ البالی کے اشتہار تھے۔

ادھر سامنے والے لان میں پارٹی چل رہی تھی اور میزبان مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ میزبان برسرِ اقتدار پارٹی کا اہم رُکن ہے جو سماج سیوا کے لیے کم اور زمانہ سازی کے لیے زیادہ مشہور ہے۔ اس نے دِلّی کے ایوانوں میں ایسی ہوا پیدا کر لی ہے کہ وہاں کے سیاست دان سمجھتے ہیں کہ کشمیر میں بس وہی ایک محبِّ وطن بچا ہے جس کے بغیر ان کی پارٹی کی کوئی وقعت نہیں رہے گی۔ وہ چالیس برس پہلے سیاسی اکھاڑے میں اترا تھا۔ ابتدا میں رائے شماری ،انسانی حقوق کی پامالی اور غریبوں کی کسمپرسی کی جذباتی و جنونی باتیں کرتا تھا، پھر پہلی فرصت میں اپنی پارٹی چھوڑ کر برسر اقتدار پارٹی میں گھس گیا اور اسمبلی کا رکن بن کر منسٹر نامزد ہو گیا۔ تب سے حکومت کے اکثر ٹینڈر اور جنگلات کے ٹھیکے اس کے رشتے داروں کے نام منظور ہوئے، کئی اہم مقامات پر معمولی قیمتوں پر بے نامی زمینیں الاٹ ہوئیں، محکمہ انڈسٹریز اور بنکوں سے جھوٹ موٹ کی کمپنیوں اور کارخانوں کے نام قرضے فراہم ہوئے اور پھر ان نام نہاد کمپنیوں کا دیوالہ نکال کر کروڑوں روپے ہڑپ کر لیے گئے۔ آج جہاں دیکھو وہاں اس کے مال کھڑے ہیں جن میں ٹافی سے لے کر ٹریڈمل تک سب کچھ بکتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ تمول کی بساط بچھانے میں جٹا رہا اور مرکزی سرکار یہ سمجھتی رہی کہ وہ کشمیر میں ہندوستان کی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔

دفعتاً بدرالدین کی نظر ایک داڑھی والے بزرگ پر پڑی جس نے اپنی داڑھی کو خضاب سے رنگ دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ حاجی صاحب اس کے ننھیال کے سامنے رہتا ہے اور اخروٹ کی لکڑی کا کام کرتا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کئی بار لکڑی کے سامان میں چرس کی

تسکری کی اور خوب مال کمایا۔ جب آسودگی کا اطمینان ہوا تو حج کر کے تائب ہو گیا۔ اب تو سبھی لوگ اسے حاجی صاحب کے نام سے ہی جانتے ہیں۔

کچھ وقفے کے بعد ایک ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر میزبان کے قریب آیا اور اسے گفتگو کرنے لگا۔ سبکدوشی کے بعد اسے حکومت نے خصوصی طور پر بحیثیت ایڈوائزر مقرر کیا ہے تاکہ وہ یہاں کے بگڑے ہوئے نظام کو درست کر سکے۔ یہ بات الگ کہ وہ خود تینتیس سال اسی نظام کا حصہ تھا اور اس نظام کو بگاڑنے میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ دراصل سبکدوشی کے بعد روپیہ کمانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔ اتنا تو خیر سب کو معلوم ہے کہ جو افسر پوری عمر بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا رہا وہ آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوگا۔ اس پر طرۃ یہ کہ اب ان کی بیگم صاحبہ نے بھی ایک این جی او کھول رکھا ہے جو قوم کو مزید لوٹنے کا ماڈرن طریقہ ہے۔

پارٹی میں مس شہناز بھی دکھائی دے رہی تھی۔ بدرالدین کو یاد آیا کہ وہ کئی بار اجنبیوں کے ساتھ اس کے گیسٹ ہاؤس میں آتی رہی اور بند کمرے میں نہ جانے کیا گل کھلاتی رہی۔ بازار سے شراب، ٹکے اور کباب تو وہ خود ہی لا کر دیتا تھا۔ آج کل شہناز کے سر پر سیاست کا بھوت سوار ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ بہت دنوں سے منسٹر صاحب کی ہر خواہش پوری کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ اسے پورا یقین ہے کہ اگلے چناؤ میں اسے ٹکٹ مل جائے گی۔ کشمیر میں مقتدر پارٹی کی طرف سے ایک بار الیکشن کی ٹکٹ مل گئی تو سمجھو چناؤ بھی ہو گیا۔ لوگ پھر ووٹ ڈالیں یا نہ ڈالیں۔

اچانک بدرالدین کو اپنی بیوی کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ عینک الماری میں چھپالی اور نیچے باورچی خانے میں چلا گیا جہاں اس کی بیوی کھانا پروسنے کے لیے انتظار کر رہی تھی۔ وہ باورچی خانے کے سامنے والی جگہ میں آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔ آناً فاناً چار بچے اس کے اردگرد جمع ہو گئے۔ بدرالدین ہر روز ان کے لیے ٹافی لایا کرتا تھا مگر آج عینک کے چکر میں وہ بھول ہی گیا۔ اس کی نظر جونہی بچوں پر پڑی وہ بوکھلا گیا۔ بچوں کے کپڑے میلے کچیلے اور

جگہ جگہ پھٹے ہوئے تھے۔ کسی کی آستین نہیں تھی اور کسی کا کالر غائب تھا۔ کسی کی ناک بہہ رہی تھی اور کوئی بخار سے تپ رہا تھا۔

''تین دن سے کہہ رہی ہوں کہ آمنہ کو بخار آرہا ہے اور اترنے کا نام بھی نہیں لیتا۔ اسے ڈاکٹر کو دکھا دو مگر تم ہو کہ تمھارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔'' بیوی نے کھانے کی پلیٹ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں ڈسپنسری گیا تھا مگر وہاں ایک ہفتے سے ڈاکٹر آ ہی نہیں رہا ہے۔ پرائیویٹ ڈاکٹر کو دکھانے کی میری حیثیت نہیں۔ وہ تو لوٹتے ہیں۔ یہ ٹیسٹ وہ ٹیسٹ۔ تم اپنے ماموں کے پاس کیوں نہیں لے جاتی؟ وہ تو عمر بھر بڑے ہسپتال میں کمپونڈر رہا ہے اور اب لوگوں کا علاج بھی کرتا ہے۔ اس کے گھر میں ہسپتال کی ساری دوائیاں پڑی ہوئی ہیں، جانچ بھی کر لے گا اور دوائی بھی دے گا۔ تم سے پیسے تھوڑے ہی مانگے گا۔''

''لو جی یہ بھی اب مجھے ہی کرنا پڑے گا۔ خیر بچوں کے سکول کی فیس بھی دینی ہے۔ وہ بھی بہت دنوں سے مانگ رہے ہیں۔''

'' فیس کس لیے چاہیے۔ دیکھو وہ مسجد میں جو بہار سے مولوی صاحب آئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو سکول بھیجنا ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے یہاں تو لڑکیوں کی بے پردگی بہت بُری مانی جاتی ہے۔ رہی بات لڑکوں کی، وہ تو اب بڑے ہو گئے ہیں، ان کو رمضان چاچا کے ساتھ طباخی کا کام سیکھنے کے لیے بھیج دیں گے۔ کچھ سیکھیں گے اور ساتھ ساتھ کما بھی لیں گے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو ان پڑھ گنوار ہوں، مجھے کیا معلوم کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ تم نے تو آٹھویں پاس کیا ہے اور دنیا بھی دیکھی ہے۔ جو مناسب سمجھو کرلو۔''

''اسی بات پر تو نوکری مل گئی تھی۔ آٹھویں پاس اور طباخی کی تربیت۔ بس گیسٹ ہاؤس کے لیے اور کیا چاہیے تھا۔''

رات بھر بدرالدین عجیب عجیب سے خواب دیکھتا رہا۔ کچھ نفیس اور سہانے خواب اور کچھ خوفناک اور ڈراونے خواب۔ وہ رات بھر بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ سب اس عینک کا کیا کرایا ہے۔

صبح ہوتے ہی اس نے عینک جیب میں رکھ لی اور پاس ہی عالی کدل پُل سے جہلم دریا میں پھینک دی۔

دو چار دن یوں ہی گزر گئے۔ بچوں نے سکول جانا بند کردیا۔ بیٹیاں ماں کے ساتھ نمدے بنانے اور ان پر کڑھائی کرنے میں لگ گئیں۔ ادھر شاہ رخ خان اور سلمان خان کی شکل و صورت والے بیٹے شادیوں میں سفید چوغہ پہن کر نظر آنے لگے۔

اس دن کے بعد بدرالدین کی آنکھوں سے خواب ہی غائب ہوگئے۔

☆☆☆☆☆

میں انّا ہوں!

لوگ جوق در جوق چلے جا رہے تھے۔ انہیں پانچ بجے رام لیلا میدان پہنچنا تھا کیونکہ انّا ہزارے نے انہیں بُلایا تھا۔ کئی لوگ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ایمرجنسی کے بعد پہلی بار دِلّی کی جنتا وقت کی پابندی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

میں فٹ پاتھ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ سامنے ایک آدمی آٹو رکشا والے سے کہہ رہا تھا۔ ''بھائی بہت جلدی ہے۔ مجھے چار بجے چاندنی چوک پہنچنا ہے۔''

''صاحب آج اس سائیڈ بہت بھیڑ ہوگی۔ وہاں جانا بہت مشکل ہے۔''

''بھائی ارجنٹ ہے۔ ابھی راستہ کھلا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے مگر دو سو لگیں گے۔''

''کیوں میٹر سے چلو۔ جتنا ہوگا دے دیں گے۔ ہو سکتا ہے میں تمہارے ساتھ ہی واپس رام لیلا میدان آ جاؤں۔ چاندنی چوک میں مجھے صرف دس منٹ لگیں گے۔''

''نہیں صاحب، مجھے اس سائیڈ جانا ہی نہیں۔ جتنی دیر راستے میں بھیڑ کے ساتھ مغز پچّی کروں گا اتنی دیر میں نئی دلی سائیڈ تین چار سو کما لوں گا۔ آپ کی مجبوری کو دیکھ کر راضی ہو گیا۔''

میں نے بیچ میں مداخلت کی۔ ''ارے صاحب مجھے بھی رام لیلا میدان جانا ہے۔ آپ ایک سو پچیس دے دیجیے اور میں پچھتّر دے دوں گا۔ اس کے دو سو برابر ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ دونوں صاحب بیٹھ جاؤ۔''

جونہی ہم دونوں آٹو میں بیٹھ گئے، آٹو والے نے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے

کے لیے میٹر ڈاؤن کرلیا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی؟''میں نے پوچھ لیا۔

''ارے صاحب راستے میں پولیس چیک کر لیتی ہے۔ اس لیے کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ پولیس والے ہمارا قافیہ تنگ کرنے کی درپے ہوتے ہیں۔ کبھی اس بات پر چالان تو کبھی اس بات پر۔ دراصل پیسہ وصول کرنے کی ترکیبیں ہیں۔ پیسہ دے دو تو سب خلاص۔''اس نے نہایت مسکین صورت بنا کر جواب دیا۔

چنانچہ چار دانگ کرپشن کی بحث چھڑی ہوئی تھی اس لیے میں اور میرا ہم سفر پورے راستے ہندوستان بنام رشوت پر بحث کرتے رہے۔ وہ کہنے لگا۔''انا ہزارے ہمارے لیے مسیحا بن کر آیا ہے۔ سچ مانیئے تو دوسرے گاندھی نے اپنی پوتر دھرتی پر جنم لیا ہے۔ آج کے ہندوستان میں ایسے ہی آدمی کی سخت ضرورت ہے۔ آج ہر دلّی والے کو رام لیلا میدان پہنچنا چاہیے۔ مجھے چاندنی چوک میں کچھ ضروری کام ہے۔ تھوڑی دیر میں نبٹ جائے گا۔ پھر میں بھی پہنچ جاؤں گا۔''

''اس سے پہلے بھی ایمرجنسی کے دوران جے پرکاش نارائن کو دوسرا گاندھی کہا جاتا تھا۔ وہ مکمل انقلاب کی باتیں کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ یہ آزادی کی دوسری لڑائی ہے۔ اس کے باوجود کچھ بھی نہ بدلا۔ اب یہ ہزارے صاحب ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں آزادی کی دوسری لڑائی لڑ رہا ہوں۔ سمجھ نہیں آتا کہ آزادی کے بعد کتنی اور لڑائیاں لڑنی پڑیں گی۔ مجھے حیرانی اس بات کی ہو رہی ہے کہ کہاں تو یہ فوج میں ایک ڈرائیور ہوا کرتا تھا اور کہاں اب دیش کا رہنما بن چکا ہے۔''

''سچ پوچھیے اس حصولیابی کے لیے آدرش، دوراندیشی اور قربانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ انا نے تو اپنی ساری زندگی قوم کے لیے وقف کی ہے۔''

آٹو ڈرائیور، جو ہماری باتوں کو غور سے سن رہا تھا، مڑ کر دونوں سے مخاطب ہوا۔

''صاحب میں بھی جانے کی سوچ رہا ہوں۔ آج لگتا ہے ساری دلّی اُمڈ پڑے گی۔''

''ہاں بھئی ضرور جانا۔ کرپشن ختم کرنے کے لیے اس مہم میں لوگوں کی شرکت اہم ہے۔''

میرے لہجے میں تھوڑی بہت تلخی آ گئی مگر میں نے جلدی ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور ہنستے ہوئے کہا۔

''بھئی دھیان رہے، انقلاب آ گیا تو میٹر کے بغیر نہیں چل پاؤ گے.....!''

اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میری بات کی ان سنی کر کے وہ واپس مڑا اور سامنے سڑک اور بھیڑ پر نظر رکھنے لگا۔

''اگر وہاں آدھے گھنٹے انتظار کرو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی لوٹ آؤں گا؟ مگر واپسی میٹر سے ہوگی.......سمجھے!'' دوسرا مسافر آٹو والے سے مخاطب ہوا۔

''ٹھیک ہے صاحب جیسے آپ کی مرضی۔'' رکشے والے نے جواب دیا۔

بات بات میں معلوم ہوا کہ میرے ہم سفر کا نام کندن لال ہے اور وہ ہمارے گھر کے پاس ہی ایک گورنمنٹ اسکول میں میتھس ٹیچر ہے۔ مجھے دفعتاً یاد آیا کہ ہمارے ایریا میں میتھس ٹیوشن پڑھانے کے سلسلے میں کندن سر کا نام کافی مقبول ہے۔ چونکہ میرا بیٹا ریاضی میں کمزور ہے اس لیے چند ایک خیر خواہوں نے کئی بار مشورہ دیا تھا کہ میتھس سیکھنے کے لیے بیٹے کو کندن سر کے پاس بھیج دو۔ آج اس سے یوں اتفاقاً ملاقات ہوگی مجھے گماں بھی نہ تھا۔ میں بیٹے کی اس کمزوری پر پہلے ہی سے فکر مند تھا اور مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ انجینئرنگ میں داخلے کے لیے طالب علم کو حساب کے مضمون میں امتیازی نمبر لانا بہت ضروری ہے۔ اس لیے پوچھ بیٹھا۔

''بھائی صاحب میں کب سے اپنے بیٹے کے لیے اچھے میتھس ٹیچر کی تلاش کر رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ بھگوان نے میری مراد پوری کر لی۔ دراصل اب اسکول میں استاد بچوں کو پڑھاتے ہی نہیں ہیں۔''

''ارے صاحب، اس بارے میں کچھ نہ پوچھیے۔ آج کل کلاس میں اوسطاً ایک سو بچے ہوتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہر طالب علم کی طرف دھیان دیا جائے۔ اب تو بہتر یہی ہے کہ بچے

کو کسی ٹیوشن کلاس میں بھیج دو۔ میرے یہاں ایک لڑکا حال ہی میں پتاجی کی ٹرانسفر کے سبب کلاس چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اب انیس ہی رہ گئے ہیں۔ چاہیں تو کل سے بھیج دو۔''

''فیس کتنی ہوگی؟''

''ہم ایک مضمون کا سات سو ماہانہ لیتے ہیں۔ طالب علم کی مرضی ہے کتنے مضامین میں ٹیوشن لینا چاہے۔''

''ٹھیک ہے میں کل ہی اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر ہو جاؤں گا۔''

آٹو والے نے مجھے رام لیلا میدان کے نزدیک اتار دیا اور خود چاندنی چوک کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے پہلے میرے ہم سفر نے بات چیت کے دوران مجھے بتایا کہ اسے کورٹ سے کچھ کاغذات کی نقل چاہیے تھی اور کورٹ کے ایک ٹائپسٹ نے جلدی سے نقل نکلوانے کا یقین دلایا ہے۔ نقل بنوانے کی فیس تین سو روپے مقرر ہے جب کہ اس نے مزید سات سو روپے کا خرچہ طلب کیا ہے۔ اب وہی کاغذات لینے کے لیے ٹائپسٹ کے گھر چاندنی چوک جا رہا تھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کہوں سات سو روپے تو بہت زیادہ ہوتے ہیں مگر اس نے جیسے میرے دل کی بات سن لی اور بنا پوچھے ہی پوری رقم کی بندر بانٹ کا بیورا دیا۔ ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ ہفتہ بھر پہلے جب پاسپورٹ کی جانچ کی خاطر پولیس والا میرے گھر آیا تھا تو اس نے دو سو روپے لینے سے صاف انکار کیا تھا اور پورے پانچ سو روپے گن کر لے گیا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔

رام لیلا میدان کی گیٹ کے باہر گاندھی ٹوپیاں بک رہی تھیں جن پر دونوں سائیڈ میں انا ہوں' پرنٹ کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے لیے ایک ٹوپی خریدنے کی ٹھان لی۔ ٹوپیاں جانچتے وقت میرے ساتھ ایک اور آدمی کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی اپنے لیے ٹوپی خریدنے لگا۔ جونہی میری نظر اس پر پڑی میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ بہت برس پہلے فوج میں میری یونٹ میں ڈرائیور تھا۔ میں نے کئی بار اسے گوہاٹی شیلانگ روڈ پر پٹرول بیچتے ہوئے دیکھا تھا اور اس بارے میں سرزنش بھی کی

تھی۔اس نے فوجی ضابطے کے عین مطابق فوراً ساودھان میں کھڑے ہوکر سلیوٹ مارا۔ہم دونوں نے مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔پھر اس نے اپنے سر پر ٹوپی پہن لی اور گیٹ کے اندر چلا گیا۔

اندر میدان سے لاؤڈ اسپیکر پر زور زور سے کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔وہ سامنے بیٹھی جنتا سے کہہ رہا تھا۔

''ہمیں ایک نئے بھارت کا نرمان کرنا ہے۔ایوانوں میں بیٹھے ان لُٹیروں سے ہمیں دیش کو بچانا ہے۔انا کی یہ کرانتی آزادی کی دوسری لڑائی ہے اور ہم تب تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ہمارا مقصد پورا نہیں ہوگا۔'جن لوکپال بل' جب تک پاس نہیں ہوگا ہم سنگھرش کرتے رہیں گے۔''

ایک طرف میرے قدم میدان کے اندر جانے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے اور دوسری طرف انا ٹوپی میرے ضمیر سے سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔یکا یک کئی سارے چہرے میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہوگئے۔آٹو رکشا والا...کندن سر...پولیس والا...کورٹ کا ٹائپسٹ ...اور فوجی ڈرائیور۔سبھی نے اپنے کھوکھلے ضمیروں کو انا ٹوپی پہنائی تھی اور بے سمت مستقبل کا انتظار کر رہے تھے۔

اسٹیج پر اب کوئی زور زور سے نعرے بلند کر رہا تھا اور لوگوں سے اونچی آواز میں جواب طلب کر رہا تھا۔

''دیش کا دوسرا گاندھی کون؟''.........''انا ہزارے۔انا ہزارے۔''

''انا تم سنگھرش کرو''.......''ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

''بھرشٹاچار مٹانا ہے''.......''بھارت کو بچانا ہے۔''

میری آنکھیں لوگوں کے سروں پر سجی ٹوپیوں کو دیکھ رہی تھیں جن پر دونوں طرف لکھا تھا۔''میں انا ہوں......میں انا ہوں۔''

دریں اثنا میں نے بھی انا ٹوپی کو اپنے سر پر اوڑھنے کی کوشش کی مگر نہ جانے کیوں میرے ہاتھ رُک گئے اور میرے دروں نے احتجاج کیا۔

''ذرا اپنے ضمیر میں جھانک کر تو دیکھو۔ کیا تم سچ مچ انا ہو؟''

دوسرے ہی لمحے میں نے ٹوپی تہہ کر کے چپ چاپ اپنی جیب میں رکھ لی اور واپس اب گھر کی طرف رخ کر لیا۔

☆☆☆☆☆

روح کا کرب

انڈین آڈِٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کی بہت بڑی افسر تھی وہ۔ نام تھا شوانگی مینن۔ جن دنوں اس نے سول سروسز کا امتحان پاس کیا تھا بہت کم لڑکیاں پاس ہوتی تھیں اور جو پاس ہوتی تھیں ان میں کہیں نہ کہیں مردوں سے پنجہ لڑانے کی خفیہ خواہش ضرور نظر آتی تھی۔

جنون، خلش اور مردوں سے سبقت لے جانے کی للک.....!

اس نے بھی ایسے ہی خواب پالے تھے۔ اکلوتی اولاد ہونے کے باعث والدین نے اسے بیٹی اور بیٹے دونوں کا پیار دیا تھا۔ مقامی کانونٹ میں تعلیم دلوائی تھی۔ اس کی ہر بات مانی تھی اور اس کی ہر خواہش پوری کی تھی مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس طرح وہ اپنی بیٹی کے اندر نرگسیت، خود سری اور خود مطلبی کا بیج بو رہے ہیں۔

پروبیشن کے دنوں میں اس کی دوستی انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس کے پروبیشنر وکاس شرما سے ہوئی۔ خوش باش، دل پھینک اور لاابالی نوجوان ......! کھانے پینے اور گانے بجانے کا رسیا .....! دونوں ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی مسوری کی سڑکوں پر دیر رات تک گھومتے رہتے اور اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈا کرتے۔ ہفتے کے دن وھسپرنگ ونڈوز ریستوراں میں پوپ میوزک اور شراب کا لطف اٹھاتے۔ مدہوشی کے انہی لمحات میں شوانگی نے اپنی زندگی کی کتاب وکاس کے سامنے اس امید کے ساتھ کھول دی کہ وہ اس کی محبت کی قدر کرے گا مگر وکاس ایسے گھر کا فرد تھا جہاں ہر چیز دولت اور حیثیت کی ترازو میں تولی جاتی تھی۔ وہ شوانگی کی فراخدلی کا فائدہ اٹھا کر صرف اپنا ٹائم پاس کر رہا تھا۔ تربیت پا کر جب دونوں اپنے اپنے گھر لوٹے، وکاس والدین کی مرضی کے

عین مطابق ریاستی وزیرِ خزانہ کے گھر بینڈ باجا برات لے کر جا پہنچا جبکہ شوانگی انتظار کی گھڑیاں گنتی رہی۔

شوانگی کی زندگی کا یہ پہلا زلزلہ تھا جس کے جھٹکے وہ عمر بھر محسوس کرتی رہی۔ شاید ان جھٹکوں کی شدّت کم ہو جاتی اگر اس کو کوئی اچھا جیون ساتھی مل جاتا لیکن اس کو نہ کوئی اپنے رتبے سے بڑا اور نہ ہی کوئی ہم پلہ لڑکا مل پایا۔ مجبور ہو کر اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس صدمے سے خود کو نکالنے کی اس نے ہزارہا کوششیں کیں لیکن نکل نہیں پائی۔ اسے یہ دنیا خود غرض، مطلبی اور دولت پرست لگنے لگی۔ وہ رات بھر ناولیں پڑھتی یا پھر ریڈیو پر مغربی گانوں کی دھنوں کے ساتھ اکیلے ہی تھرکتی۔ پھر بھی وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ سگریٹ اور شراب کا سہارا بھی اب اسے کم پڑنے لگا تھا۔

جب زندگی سے امید کافور ہو جاتی ہے تو آدمی چستی، چالاکی اور جامہ زیبی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ عجیب سا آلکس اس کو جکڑ لیتا ہے یہاں تک کہ کوئی کام کرنے کو جی نہیں کرتا۔ شوانگی کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ کہتے ہیں آلسی سدا روگی۔ شوانگی کے بدن پر چربی کی تہیں روز بروز چڑھتی گئیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ موٹی ہونے لگی اور ساتھ ہی اس کی کام کرنے کی اِچّھا بھی کم ہوتی گئی۔ زندگی کے سارے منصب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اب تو زندگی کا نصب العین محض صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا رہ گیا تھا۔

بہرحال زندگی تو بسر کرنا تھی۔ وقتی دوست ملتے رہے لیکن شراب پی کر سب اپنے گھر لوٹ جاتے اور شوانگی اپنے فلیٹ کی دیواروں سے رات بھر باتیں کرتی رہ جاتی۔ ان دوستوں میں ایسا کوئی بھی نہ تھا جو اسے پیار کے دو لفظ کہہ دیتا یا پھر اس کو اپنا لیتا۔ زندگی اتنی کٹھور ہو جائے گی اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ پہلے تو ماں باپ کا سایہ سر پر تھا لیکن اب تو وہ بھی نہ رہا تھا۔

ایک روز دفتر میں بڑے بابو سے یوں ہی بات چیت ہو رہی تھی۔ شوانگی اپنے من کی بے

چینی کو چھپا نہ سکی۔ بڑے بابو نے آفس کے ایک سابقہ ملازم کے بارے میں بتا کر شوانگی کو حیرت میں ڈال دیا۔

''میڈم آپ کو معلوم ہے ہمارے آفس میں ایک کیژول مزدور کام کرتا تھا۔ نام تھا سدانند۔ بڑا ہی نیک، شریف، اور روحانی قسم کا آدمی تھا۔ ان دنوں بڑے صاحب نے اس کی حالت پر ترس کھا کر اسے محکمے میں عارضی طور پر لگا دیا۔ چار پانچ سال کام کرتا رہا اور پھر ایک دن اچانک غائب ہو گیا۔ سپریم کورٹ نے انہی دنوں کیژول ایمپلائیز کو مستقل کرنے کے آرڈر دیے سو ہم اس کو ڈھونڈنے لگے۔ پتہ چلا کہ اس نے دنیا تیاگ دی ہے اور سر گاؤں میں اپنا ایک آشرم بنایا ہے۔ اسے ڈھونڈنے گئے تو وہاں کا منظر ہی نرالا دیکھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں سوامی سدانند کے درشن کرنے چلے آرہے تھے۔ رات دن بھجن کیرتن چل رہا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ سوامی جی نے بہت سارے لوگوں کی مشکلیں آسان کردی ہیں یہاں تک کہ کئی مریضوں کو صحتیاب بھی کیا ہے۔ دفتر میں کوئی اس بات پر یقین ہی نہ کر سکا۔ ہم تو اس کو بیوقوف اور نکما سمجھتے تھے۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے بڑے بابو۔ اس جلد نما قبا کے نیچے کیا کچھ چھپا ہے کسی کو نہیں معلوم۔ ہم سب مکھوٹے پہن کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اصلیت تو اوپر والا ہی جانتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ ایسے لوگوں میں عجیب سی روحانی طاقت پوشیدہ ہوتی ہے۔'' شوانگی نے اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔

اس روز کے بعد شوانگی کے من میں سوامی سدانند کو ملنے کی شدید آرزو پیدا ہوگئی مگر ساتھ ہی ایک الجھن نے اپنا سر ابھارا۔ دل کہتا تھا کہ جا کر سوامی جی کے درشن کرلوں لیکن دماغ مان نہیں رہا تھا۔ وہ فکر و تردد میں پڑ گئی۔

''ایک ادنیٰ سے ملازم کے پاس اپنا سر جھکاؤں۔ یہ کیسے ممکن ہے!'' عقل نے ٹھوکا دیا۔

''وہ اب تمہارا ملازم نہیں رہا۔ اس نے ساری دنیا تیاگ دی ہے۔ وہ تو بھگوان کا سروپ ہے۔'' عشق نے رہنمائی کی۔

''لوگ کیا کہیں گے۔اتنی بڑی افسر اور اتنے چھوٹے سے ملازم کے پاس سر جھکانے کے لیے چلی گئی۔'' عقل نے پھر تنبیہ کی۔

''لوگوں کا کیا ہے۔وہ تو کہتے ہی رہتے ہیں۔انہوں نے بھگوان رام کو بھی نہیں چھوڑا۔ بھگوان کے گھر میں اونچ نیچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔'' عشق پھر چراغِ راہ بن گیا۔

عقل اور عشق کی آپسی کشاکش کئی دن چلتی رہی اور آخر کار ایک دن عقل نے ہتھیار ڈال دیے۔

اس روز وہ کھادی کی ساڑی میں ملبوس سر گاؤں پہنچ گئی۔آج اس کو اپنا آپ نہ جانے کیوں ہلکا سا محسوس ہو رہا تھا۔شاید دنیا کے بندھنوں سے آزاد ہونے کے لیے یہ اس کا پہلا قدم تھا۔

کیسے کیسے بندھنوں میں جکڑی تھی وہ.....!اتنی پڑھی لکھی اور ذہین افسر مگر ان چھوٹے چھوٹے بندھنوں سے خود کو چھڑا نہیں پا رہی تھی۔اکیلی جان...!معقول تنخواہ...!اب تو اس نے ایک بڑا سا گھر بھی خرید لیا تھا مگر اس میں رہنے سے وہ ڈر رہی تھی۔عدم تحفظ کے احساس نے اسے جکڑ لیا تھا۔اسی لیے پورے مکان کو کرایے پر اٹھا لیا اور خود ایک فلیٹ میں منتقل ہو گئی۔مکان سے جو کرایہ وصول ہوتا تھا وہ فلیٹ کے کرائے سے دوگنا تھا۔اس کارروائی میں بھی اس نے مالی فائدہ ڈھونڈ نکالا۔سرکاری دورے پر چلی جاتی تو ہمیشہ اس بات کی کوشاں رہتی کہ میزبان اس کی بل ادا کرے۔دیگر افسروں کی طرح ٹی اے بل کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی۔جو اخراجات کبھی ہوتے بھی نہ تھے انہیں بھی اپنی ٹی اے بل میں دکھا دیتی۔کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے خرچوں پر کیئر ٹیکر سے لڑ بیٹھتی۔

سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ روپے پیسے کے معاملے میں اتنی بخیلی کیوں کرتی تھی۔کون تھا جس کے لیے وہ یہ ساری پونجی جمع کر رہی تھی۔ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کنجوس تھی۔کنجوس ہوتی تو کیا سگریٹ

اور شراب پر اس طرح دولت لٹا دیتی۔ بس کچھ عادت سی پڑی تھی جسے چھٹکارا نہیں مل رہا تھا۔ جب تک دم ہے تب تک غم ہے۔

خیر اب آشرم میں اس کا آنا جانا معمول بن گیا۔ سوامی جی کو اس کے بارے میں کہیں سے معلومات فراہم ہو چکی تھیں۔ وہ شوانگی کی خاطر خواہ عزت کرتا تھا اور اس کو زندگی کی حقیقت سے سمجھوتا کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شوانگی کی زندگی یوں ہی ضائع ہو جائے۔ شوانگی بھی آشرم کے ماحول کے ساتھ گھل مل گئی۔ ہر ہفتے جمعہ کی شام کو آفس بند ہونے کے بعد بلا ناغہ آشرم پہنچ جاتی اور پھر اتوار کی شام گھر لوٹ آتی۔ اس دوران میں آشرم کے رکھ رکھاؤ میں وہ بھرپور حصہ لینے لگی۔

چند سالوں کے بعد شوانگی ریٹائر ہو گئی۔ وہ نوکری سے سبکدوش کیا ہوئی کہ آفس سے جیسے روح ہی چلی گئی۔ وہ چہچہانا، وہ ٹھہاکے لگا کر ملازموں سے باتیں کرنا، بات بات پر پارٹیاں اور گانا بجانا۔ جب وہ چلی گئی تو آفس میں ایک خلاء سا چھوڑ گئی۔ اس کے بعد وہ تن، من اور دھن سے آشرم کے کاموں میں منہمک ہو گئی۔

پھر بھی اس کے لیے جیون کا رہسیہ ابھی تک نہیں کھلا تھا۔ وہ اپنے دل و دماغ پر جتنا زور ڈالتی اتنی ہی مایوس ہو جاتی۔ سوامی جی نے بھی حتی الامکان کوشش کی کہ شوانگی کسی بھی طرح سنبھل جائے مگر اس کے من میں پیدا ہوئے اندیشے مٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

کچھ وقفے کے بعد شوانگی آشرم میں منتقل ہو گئی۔ رات کو جب وہ اپنے کمرے میں اکیلی ہوتی تو سوچ کے سمندر میں ڈوب جاتی۔ چپکے سے اپنا بریف کیس کھولتی اور سارے پاس بک، سیونگ سرٹیفکیٹ، شیئر، بانڈ اور مکان کے کاغذات کھول کر بیٹھ جاتی۔ اس کو اپنے آپ پر ہنسی بھی آتی اور رحم بھی۔ ان کاغذات کو سامنے رکھ کر وہ خود سے سوال کرتی کہ کس لیے ان سب چیزوں کو وہ عمر بھر جمع کرتی رہی؟ آخر کس کے لیے؟ جب یہ نہیں تھے اس وقت بھی اتنے ہی دال چاول کھایا کرتی

جتنے اب کھاتی ہے۔کوئی فرق تو پڑا نہیں۔اسے یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان سب چیزوں کا وہ کیا کرے۔پائی پائی جوڑی یہ دولت اب اسے فضول لگ رہی تھی۔ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر تیرنے لگتی۔

آخر کار اس نے ایک دن اپنے وکیل کو بلایا اور اسے کہنے لگی۔

''نارنگ جی، مجھے اپنی وصیت کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے میڈم، جیسے آپ فرمائیں گے ویسا ہی ہوگا۔''

شوانگی نے نارنگ کے سامنے سارے کاغذات کھول کر رکھ دیے اور اسے پوچھا۔

''کیا آپ ان کا مارکیٹ پرائس بتا سکتے ہیں؟''

''میں تو وکیل ہوں۔میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ہاں اندازہ لگا سکتا ہوں۔''

''اندازے سے ہی بتایئے۔''

نارنگ نے سبھی کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے، پھر کیلکولیٹر پر کچھ حساب کرنے لگا اور اس کے بعد گویا ہوا۔''یہی کوئی ایک کروڑ کی جائیداد ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔اس کا وصیت نامہ بنا لیجیے۔''

''کس کے نام؟'' نارنگ نے سوال کیا۔

''سوامی سدانند ٹرسٹ کے نام۔اس میں یہ تحریر ہونا چاہیے کہ جب میں مر جاؤں گی تو یہ ساری جائیداد ٹرسٹ کی جائیداد بن جائے گی۔اس کام میں جو بھی خرچہ ہوگا وہ مجھ سے لے لیجیے اور رجسٹریشن کے بعد وصیت نامے کی کاپی سوامی جی کو بھی بھیج دیجیے۔''

وکیل اس کو دیکھتا رہ گیا۔آج شوانگی کے چہرے پر انبساط اور سکون نظر آرہا تھا۔

اس رات وہ ایسے سوئی جیسے زندگی میں کبھی نہ سو پائی تھی۔

☆☆☆☆☆

طفیلی بیل

اس کے ساتھ طفیلی بیل کب چمٹ گئی، اسے پتا چلا نہ مجھے احساس ہوا۔

خودرو پیڑ تھا۔ بیج سے پھوٹا، بارش کے پانی نے سینچا، قدرت نے رکھوالی کی اور چند ہی برسوں میں سرسبز، قدآور، تندرست اور توانا درخت بن گیا۔ ہرے پتوں پر جب خورشید کی شعائیں پڑتی تھیں تو اوپر سے نیچے تک توانائی پیدا ہوجاتی جو اس کی حیات کی ضامن تھی۔ اور پھر جب ہوائیں چلتی تھیں تو شاخیں جھوم جھوم کر رقص کرتی تھیں۔

میں نے اپنے باغ میں طرح طرح کے پیڑ پودے لگائے تھے، کچھ سدابہار اور کچھ برگ ریز۔ جنگلے کے ساتھ ساتھ گُل مہر، املتاس کچنار، پیلٹوفورم اور سلور اوک کے درخت لگے ہوئے تھے جبکہ اندر میانہ قد کے پیڑوں کی ایک اور قطار تھی جن میں ساونی، ہرسنگھار، گارڈینیا، دن کا راجہ اور رات کی رانی شامل تھے۔ کیاریوں میں مختلف قسم کے بیسیوں موسمی پودے لگائے جاتے تھے جن سے باغ لالہ زار ہوجاتا تھا۔

البتہ اس درخت کی بات ہی کچھ انوکھی تھی۔ باغ میں جنگلی پودوں کو ویسے ہی اکھاڑ دیا جاتا ہے مگر نہ جانے کیوں مجھے اس پودے کے ساتھ کچھ لگاؤ سا ہوگیا۔ اس کے سدابہار پتے خوشنما لگتے تھے۔ اس لیے میں نے اس پیڑ کو تراشنا یا کاٹنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اس کو اپنے انداز سے جینے اور پھلنے پھولنے دیا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہتا تھا کہ یہ پودا آگے جا کر بہت ہی دلکش درخت بن جائے گا اور اس پر خوبصورت پھول نکل آئیں گے۔ شاید مزے دار پھل بھی نکل آئیں۔

ایک روز میرا ایک دوست ارشد جمال، جو علم نباتات کا ماہر ہے، میرے گھر آیا۔ ہم

ڈرائنگ روم میں بیٹھے گفتگو کررہے تھے کہ مجھے اس پیڑ کا خیال آیا۔ میں نے ارشد سے اس بارے میں بات کی۔ ''یار میرے باغ میں ایک خودرو پیڑ اُگ آیا ہے۔ بہت ہی نرالا پیڑ لگ رہا ہے۔ اس سے پہلے ایسا پیڑ کبھی میری نظروں سے نہیں گزرا ہے۔ نہ جانے کون سا پیڑ ہوگا؟''

''چلو مجھے دکھادو، شاید میں پہچان لوں۔''

میں ارشد کو باغ میں لے گیا اور وہاں اسے پیڑ دکھایا۔ وہ دیکھتے ہی مسکرایا اور گویا ہوا۔ ''یار یہ پیڑ یہاں کیسے آیا۔ بہت ہی نایاب قسم کا پیڑ ہے۔ بس جنگل میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ اس کا پھول رنگین اور مہک دار ہوتا ہے۔ میگنولیا کی مانند اس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی ہے۔ پھل بھی ادویات میں کام آتا ہے۔ اسے یوں ہی بڑھنے دو مگر وقتاً فوقتاً دیکھتے رہنا۔'' اس نے پیڑ کا کوئی لاطینی نام بتایا جو چند دنوں کے بعد میرے حافظے سے اتر گیا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ پیڑ اپنی جگہ بڑھتا رہا اور باغ اپنی جگہ لہلہاتا رہا۔ خودرو پیڑ تھا اس لیے اس کی طرف زیادہ دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ تین سال بعد اس پر خوبصورت قرمزی پھولوں کے گچھے پیدا ہوگئے جو کانوں کی بالیوں کی طرح شاخوں سے آویزاں تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے خوابوں کی تعبیر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بہت خوشی ہوئی کہ چلو میرا اندازہ سہی نکلا۔ اس پیڑ نے باغ کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے۔

اگلے سال جب میری نظر اس پر پڑی کوئی رسی نما بیل سانپ کی مانند اس کے تنے سے لپٹی ہوئی چڑھ رہی تھی۔ دونوں کے پتے ایک دوسرے سے خلط ملط ہو رہے تھے۔ مجھے تعجب ہوا۔ پھر سوچا جانے دو، ایسی کئی بیلیں درختوں، دیواروں اور جنگلوں کا سہارا لے کر زندگی بسر کرتی ہیں۔ کئی جنگلی بیلوں کے پھول اتنے خوبصورت ہوتے ہیں کہ ان کے بیج یا قلم آرائش کے لیے کسی دوسرے درخت، دیوار یا جنگلے کے ساتھ عمداً بوئے جاتے ہیں۔ خیر یہ تو فطرت کا قانون ہے کہ کچھ جاندار چیزیں بنا سہارے کے نشو و نما نہیں پاسکتیں۔ اس لیے میں نے دیکھ کر ان دیکھی کرلی۔

ابھی چند مہینے بھی نہ گزرے کہ میزبان پیڑ کے پتّے نہ صرف زرد پڑ گئے بلکہ جھڑنے لگے جبکہ بیل کے پتّے خوب چمک دار اور سرسبز تھے۔ مجھے کافی تشویش ہوئی۔ دفعتاً مجھے یہ خیال کچوکنے لگا کہ کہیں یہ بیل طفیلی اور ضرر رساں نہ ہو۔

یہ کارخانۂ حیات بھی عجیب سا ہے۔ سب جگہ مسابقتی نظام کام کرتا ہے۔ کچھ پیڑ خودرو اور خود پرور ہوتے ہیں۔ اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ سورج کی حرارت، زمین کی نمی اور غیر نامیاتی مادّے سے خود ہی اپنی خوراک بناتے ہیں۔ اپنے علاوہ چرند و پرند اور انسان تک کو خوراک مہیا کرتے ہیں۔ لیکن ایسے پیڑ بھی ہیں جنھیں دوسرے پیڑوں کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان میں سے کچھ ہم زیستی کے اصول پر کاربند رہتے ہیں جس میں باہمی تعاون اور استفادہ ملحوظ خاطر رہتا ہے جبکہ کچھ طفیلیے ہوتے ہیں جو صرف اپنا فائدہ سوچتے ہیں چاہے دوسرے کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

دیکھا جائے تو انسانی سماج میں بھی یہی طریقۂ کار مستعمل ہے۔ انسانوں میں بھی کچھ لوگ خود کفالیت، کچھ باہمیت اور کچھ طفیلیت میں یقین رکھتے ہیں۔ طفیلی انسان اکثر زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جاتا ہے اور اپنے میزبان کو تڑپتا چھوڑ جاتا ہے۔

میں نے بیل کو جڑ سے اکھاڑنے کا فیصلہ کر لیا مگر اس سے پہلے اپنے دوست کو دکھانا ضروری سمجھا۔ روزانہ سینچائی اور کھاد ڈالنے کے باوجود پیڑ تپ دق کے مریض کی طرح سوکھتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو اس کے پھول آنے بھی بند ہو گئے تھے۔ پھل کی تو بات ہی نہ تھی۔ میں نے ٹیلیفون پر ارشد جمال کو معاملے سے آگاہ کیا اور اسے گھر آنے کی تاکید کی۔ اس نے پیڑ کی حالت دیکھتے ہی دانتوں تلے اپنی انگلی دبائی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے اس بیل کو چڑھنے ہی کیوں دیا۔ کیا تم نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟ یہ تو طفیلی بیل ہے جو میزبان کا چوب رس چوس لیتی ہے۔ اس بیل نے تو درخت کو کھوکھلا کر دیا ہے۔“

''میں نے اسے پہلے دیکھا تھا مگر معمولی جنگلی بیل سمجھ کر نظر انداز کر لیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ طفیلی بیل ہے۔ نہ جانے کہاں سے یہ نحوست آ گئی اور اس خوبصورت درخت کے ارد گرد لپٹ گئی۔'' میں نے انکساری سے جواب دیا۔

''بھائی، یہی تو طفیلیوں کی خاصیت ہے۔ بیج سے پھوٹتے ہی اپنا سہارا ڈھونڈ لیتے ہیں اور زمین کی بجائے میزبان درخت میں اپنی جڑیں گھسیڑ کر اس کا پانی اور خوراک کھینچ لیتے ہیں۔ ان کا تنا لپٹتا ہوا میزبان پیڑ پر چڑھتا ہے، پھلتا ہے پھولتا ہے اور اس کے برعکس میزبان پیڑ دھیرے دھیرے مرجھا جاتا ہے۔''

میں نے پیڑ پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مہمان بیل میزبان پیڑ کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہے۔ ''دیکھو تمہاری کیا حالت ہو گئی ہے اور میں ایک ہی سال میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔ تم سے اونچی بھی اور تنومند بھی۔''

اس دن کے بعد میں نے بیل کو نیست و نابود کرنے کی ٹھان لی۔ جہاں بھی دِکھتی تھی، کاٹ لیتا۔ مگر ایک طرف سے کاٹتا تھا تو وہ دوسری طرف سے نمودار ہو جاتی۔ بازار میں کوئی ایسی نباتات کُش دوائی بھی تو دستیاب نہ تھی جو میزبان کے جسم کے اندر طفیلی جڑوں کو ختم کر دیتی۔ دشمن باہر ہو اور نظر آئے تو اس کو مار بھی سکتے ہیں مگر جب دشمن جسم کے اندر براجمان ہو تو اسے مارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس پیڑ کی بحالی کی امید لے کر میرے پاس اب دعا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

کئی دن ایسے ہی بیت گئے۔ ایک روز میں صبح سویرے باغ میں یوں ہی ٹہلنے کے لیے نکلا کہ منظر دیکھ کر میرے ہوش ہی اڑ گئے۔

وہ درخت زمین پر اوندھا گر پڑا تھا۔

☆☆☆☆☆

گونگا کیئر ٹیکر

انگریزوں کے زمانے سے وہ اس گیسٹ ہاؤس کا نگراں تھا۔ متّقی اور پرہیزگار، نیک نیت اور صاف باطن۔ کپڑے ہمیشہ اجلے اجلے اور بے داغ پہنتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سن چالیس میں ایک رحم دل انگریز افسر نے اسے گیسٹ ہاؤس کا کیئر ٹیکر مقرر کیا حالانکہ اسے بخوبی معلوم تھا کہ رمضان جو گونگا ہے۔ جن دنوں وہ آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اسے زوروں کا بخار آیا جس کے باعث اس کی قوت گویائی چلی گئی مگر خدا کی مہربانی سے قوت سامعہ برقرار رہی۔ ترسیل میں تھوڑی بہت پریشانی اٹھانی پڑتی تھی لیکن اس نے پہلے اپنی بیوی اور پھر لڑکے کی مدد سے اس پریشانی کا ازالہ کیا۔ کمروں کی صفائی اور رکھ رکھاؤ میں وہ ذاتی دلچسپی لیتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انگریز خصلتاً صفائی پسند ہوتے ہیں۔ آج تک کسی نے اس کے کام یا کردار پر انگلی نہیں اٹھائی۔ اس کے برعکس کئی افسروں نے رخصت کے وقت اس کے کام سے خوش ہو کر سندیں بھی عطا کیں۔

اس نے قریب قریب چالیس سال اس گیسٹ ہاؤس کی رکھوالی کی۔ مہمان، جو زیادہ تر گورنمنٹ ملازم ہوتے تھے اور ماتحت دفتروں کا معائنہ کرنے کے لیے یہاں آتے تھے، کبھی فیملی لے کر اور کبھی فیملی کے بغیر دو چار روز رہ کر چلے جاتے۔

البتہ آزادی کے بعد ہوا ہی پلٹ گئی۔ جمہوریت کے سبب سارا نظام بدل گیا۔ پٹھوں نے زیرکوں کی جگہ لے لی۔ غنڈوں شہدوں نے عنان حکومت سنبھالی اور ان کے مؤید اعلیٰ کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ رمضان جو اس بارے میں اکثر اپنی بیوی سے اشاروں میں ذکر کر لیتا۔ وہ پہلے پہل اس کی بات سمجھ نہیں پا رہی تھی لیکن بعد میں جب اس نے نئے مہمانوں کا رویہ دیکھا تو خاوند

کے اشاروں کا مطلب سمجھنے لگی۔

''زونی، اب وہ بات نہیں رہی جو انگریزوں کے زمانے میں تھی۔ وہ بڑے نفاست پسند اور دین دار تھے۔ اب تو خدا ہی بچائے ان لفنگوں اور بدمعاشوں سے۔ نہ کوئی تمیز اور نہ ہی کوئی تہذیب۔ ہوس اور حرص کے پتلے ہیں سب۔ آگے سے میری غیر حاضری میں جب بھی کوئی آیا کرے گا، نہ خود اس کے سامنے آنا اور نہ فرزانہ کو بھیجنا۔ رشید کی بات الگ ہے، وہ تو لڑکا ہے۔''
رمضان جو سوچ تو سکتا تھا مگر کہہ نہیں پاتا تھا۔ اس لیے ہاتھوں کے اشاروں سے سمجھانے لگا۔ مگر زونی خاوند کے پژمردہ چہرے اور نم آنکھوں کو دیکھ کر ہی اس کے ذہن پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے میں کامیاب ہوگئی۔ خود اس کے زرد چہرے پر بھی یاسیت چھا گئی۔

رمضان جو کو پہلا دھچکا اس دن لگا جب اس کے گیسٹ ہاؤس میں فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کا کنزرویٹر پیرزادہ ہمایوں اشرف آ گیا۔ دیر رات تک ڈائننگ ہال میں پارٹی ہوئی۔ ماتحت افسر پارٹی میں شریک ہونے کے لیے اپنی بیویوں کے ہمراہ چلے آئے تھے۔ جو بیبیاں گھر میں پردہ کرتی تھیں وہ ہاتھوں میں پیمانے لیے اپنی خوبصورتی کی نمائش کر رہی تھیں۔ ہر ایک نے زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے اور کندھوں پر پشمینے کے شال لہرائے تھے۔ اوڑھنے کے لیے نہیں محض اپنی ثروت کی نمائش کرنے کے لیے۔ چہروں پر گلال، آنکھوں میں کاجل، ہونٹوں پر لپ اسٹک، کانوں میں آویزے، کلائیوں میں طلائی چوڑیاں اور بدن پر حریری لباس۔ ہال مسلسل قہقہوں اور غیر معیاری لطیفوں سے گونج رہا تھا۔ شراب اور طعام کا انتظام ماتحت افسروں نے نزدیکی ہوٹل سے کروایا تھا جبکہ کیئر ٹیکر سے صرف داخلی انتظام کی مانگ کی گئی تھی۔ رخصت کے وقت ایک افسر نے خوش ہو کر رمضان جو کو بلایا اور دو رم کی بوتلیں بطور بخشش دینے کی کوشش کی۔

''رمضانا، یہ دو بوتلیں تمہارے لیے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کن افسروں سے پالا پڑ گیا تھا''

رمضان جُو نے خفیف سی ہنسی ہنس کر ہاتھوں کے اشارے سے بوتلیں لینے سے انکار کر دیا۔ دل میں سوچنے لگا کہ کاش میری زبان ہوتی تو کھری کھری سنا دیتا۔ اس نے ایسے ایسے افسر دیکھے تھے کہ اس بخشش دینے والے کو ان کی جوتی کے برابر بھی نہ سمجھتا تھا۔ افسر کھسیانا ہو کر رہ گیا۔ آہستہ آہستہ سبھی لوگ چلے گئے۔ ہال میں اتنا کوڑا بکھرا پڑا تھا جس کو صاف کرنے میں پورے دو دن لگ گئے۔ رمضان جُو کو اس زائد کام کے عوض بل کی رقم کے علاوہ صرف پچیس روپے بطور ٹپ مل گئے۔ صفائی کرتے وقت اس کو بار بار افسر کی بات یاد آرہی تھی ''رمضانا، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کن افسروں سے پالا پڑا تھا۔''

اس واقعے کے بعد بھی دو ایک ایسی ہی وارداتیں پیش آئیں تھیں جن کی وجہ سے رمضان جُو بہت پریشان رہنے لگا لیکن روزگار کی مجبوری تھی اس لیے روح پر یہ پیکان سہتا رہا۔ گھر میں اپنے علاوہ چار اور افراد تھے۔ بیوی، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ بچے نزدیک ہی ایک گورنمنٹ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اکیلا ہوتا تو بہت پہلے نوکری کو لات مار کر خدا خدا کر لیتا۔

کئی بار چند ایک اعلیٰ افسر پرائی عورتوں کے ساتھ گیسٹ ہاؤس میں رہے۔ مرد عورت ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گھل مل کر رہتے تھے جیسے برسوں سے ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوں۔ ابتدا میں سیدھے سادے رمضان جُو کو گماں بھی نہ گزرا کہ یہ جعلی جوڑے ہیں مگر اس کی بیوی نے تاڑ لیا اور شوہر کو چوکنا کر دیا۔ خیر رمضان جُو کو جب پتہ چلا تو وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ کرتا بھی کیا؟ اس کی سننے والا کون تھا۔ ایک مہمان تو پولیس کا بہت بڑا افسر تھا اور دوسرا ریاستی قانون ساز یہ کا ممبر۔ پھر اس معمولی سے کیئر ٹیکر کی کیا مجال تھی کہ وہ ان سے پوچھ تاچھ کر لیتا یا پھر پولیس کو خبر کر لیتا۔ بیوی نے جب اپنا اندیشہ ظاہر کیا وہ بس آنسو پی کر رہ گیا۔ اس نے اپنے آپ سے کئی بار سوال کیا۔

''کیسے کیسے لوگ آتے ہیں یہاں؟ نہ ایمان نہ دھرم۔ عورتیں بھی بے حیا ہو چکی ہیں۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں ایسا اندھکار نہیں تھا۔ انھوں نے کبھی ایسی حرکتیں

نہیں کیں ۔شراب ضرور پیتے تھے مگر یہ بے حیائی اس زمانے میں کبھی نہیں دیکھی ۔اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔جی چاہتا ہے کہ نوکری چھوڑ چھاڑ کر واپس اپنے گاؤں چلا جاؤں مگر ڈر لگتا ہے۔وہاں کیسے گزر بسر ہوگی اور وہ بھی اتنا بڑا عیال لے کر۔زمین جائیداد تو اتنی ہے نہیں جس پر گزارہ ہو سکے۔اب تو خدا ہی معاف کرے ورنہ ان کمینوں نے تو مجھے اپنے گناہوں میں شریک کر دیا۔"

پھر ایک روز زلزلہ آیا۔ایکسائز کمشنر انسپکشن کے بہانے گیسٹ ہاؤس میں وارد ہوا۔ پست قد، دبلا پتلا اور سیاہ فام۔احساسِ کم تری کو چھپانے کے لیے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اور اونچی آواز میں فر فر بولتا تا کہ لوگ مرعوب ہو جائیں۔ سالا، بلڈی، باسٹرڈ اور سن آف اے بچ ۔یہ سارے الفاظ اس کا تکیہ کلام بن چکے تھے خاص کر جب وہ اپنے ماتحتوں کو حکم دیتا یا ان پر اپنا غصہ اتارتا۔وہ جس وقت گیسٹ ہاؤس میں وارد ہوا رمضان جو سامان خریدنے کے لیے بازار چلا گیا تھا۔گیسٹ ہاؤس کا دروازہ رمضان جو کی بڑی بیٹی فرزانہ نے کھولا جو زندگی کے سترھویں پائیدان پر قدم رکھ چکی تھی۔اس کے پُر نور چہرے کو دیکھ کر افضل کریم کی نظریں چندھیا گئیں۔دروازہ کھول کر فرزانہ نے وی آئی پی سویٹ کی طرف اشارہ کیا اور پھر گویا ہوئی۔

"صاحب جی،آپ کے لیے یہ سویٹ بُک ہے۔آپ جا کر فریش ہو جائیے۔گیزر میں پانی گرم کر کے رکھا ہے۔اتنی دیر میں بابا آجائیں گے۔سبزی لانے گئے ہیں۔چائے وائے کی ضرورت ہو تو بیل بجا دیجیے۔" فرزانہ نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی شیطانی چمک دیکھی اس لیے شتابی سامنے سے ہٹ کر غائب ہو گئی۔

افضل کریم اور اس کا اردلی سامان لے کر سویٹ کے اندر چلے گئے۔اردلی نے صاحب کا سامان ڈھنگ سے سجا کر بیگ میں سے دو وہسکی کی بوتلیں اور کچھ ناشتہ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔دفعتاً اسے دھیان آیا کہ پینے کے لیے دو چار گلاس ہونے چاہئیں۔اس لیے دوڑتا ہوا کچن کی

طرف چلا گیا اور 'کوئی ہے، کوئی ہے' پکارتا ہوا کچن کے اندر گھس گیا۔ فرزانہ آواز سن کر دوڑی چلی آئی۔ اَردلی کے مانگنے پر اس نے جلدی سے ٹرے میں چار گلاس رکھ کر دے دیے۔

فضل کریم نے ہاتھ منہ دھولیا، کپڑے بدل لیے اور پھر سفر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے شراب پینے لگا۔ شراب کیا پی رہا تھا مانو فرزانہ کا شباب اس میں گھول کر پی رہا تھا۔ آخر کار اسے رہا نہ گیا۔ اَردلی سے کہنے لگا۔ ''لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ خدا جانے کس کے نصیب میں ہوگی؟''

اردلی اپنے صاحب کی رگ رگ سے واقف تھا۔ فوراً جواب دیا۔ ''سر، اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔ کوئی نواب تو ملے گا نہیں۔ کرے گی کسی کنجڑے قصائی سے شادی۔''

''بے چاری کے بھاگ پھوٹے ہیں۔ ورنہ حسن تو بے مثال ہے۔''

اَردلی اشارہ سمجھ گیا لیکن اس کی عقل کے توتے اُڑ گئے۔ اِدھر شراب کے دور چلتے رہے اور دماغ میں فتنے جنم لیتے رہے۔ دریں اثنا رمضان جو بازار سے واپس آیا اور سویٹ کے دروازے پر دستک دی۔

''کم ان۔'' افضل کریم نے بلند آواز میں کہا۔

رمضان جو اندر آیا اور اشاروں کی زبان میں پوچھنے لگا۔ ''مجھے امید ہے کہ رہنے کا انتظام اطمینان بخش ہے۔'' پھر گھڑی کی طرف دیکھ کر وہ ہاتھوں کے اشارے سے پوچھنے لگا۔ ''صاحب، ڈنر کب کریں گے؟

افضل کریم حیرت میں پڑ گیا کہ یہ آدمی بات کیوں نہیں کرتا ہے۔ اَردلی اس کی دبدھا سمجھ گیا۔ چنانچہ وہ پہلے بھی ایک دو بار اس گیسٹ ہاؤس میں آچکا تھا اس لیے رمضان جو سے تھوڑی بہت واقفیت ہو چکی تھی۔ وہ اپنے افسر سے مخاطب ہوا۔

''سر، یہاں کا کیئر ٹیکر ہے، رمضان جو۔ باتیں سن لیتا ہے مگر بول نہیں پاتا۔ پوچھ رہا ہے کہ ڈنر کب کریں گے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتائیے، میں انتظام کراؤں گا۔''

افضل کریم کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''بول نہیں سکتا تو پھر کسی اور کو بھیجنا چاہیے تھا۔ خیر دیکھ لو اگر کچھ انتظام ہو سکے۔''

اردلی اٹھ کھڑا ہوا اور رمضان جُو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کو باہر لے گیا۔ پھر کان میں ایسے بولنے لگا جیسے کوئی راز کی بات بتا رہا ہو۔ ''رمضانا، یہ ہمارے بہت بڑے افسر ہیں۔ ہماری نوکری انہی کے دم سے ہے۔ تم ان کا کام کر دو مہربانی ہوگی۔''

رمضان جُو اس کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

اردلی نے یک لخت ساری شرم وحیا کی دیواریں گرا کر اس کے کان کے ساتھ دوبارہ منہ لگا یا۔

''صاحب کو تمہاری لڑکی بہت پسند آئی۔ ڈنر کے بعد میں چلا جاؤں گا۔ تم اس کو صاحب کے پاس بھیج دینا۔ منہ مانگا انعام مل جائے گا۔ صاحب بڑے ہی فیاض آدمی ہیں۔''

رمضان جُو کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس کی قوت گویائی تو تھی نہیں مگر اب اس کے ہوش وحواس بھی اڑ گئے۔ یہ زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس کو ایسے الفاظ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے نہ جانے کیسے اپنی پلکوں پر آنسوؤں کا سیلاب روک لیا اور بنا کچھ کہے اپنی رہائش میں چلا گیا۔

فرزانہ کو دیکھتے ہی رمضان جُو نے اس کی گال پر زوردار تھپڑ رسید کیا اور اشاروں میں اسے سوال کیا کہ اسے مہمانوں کے لیے دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی۔ فرزانہ تو چپ رہی مگر اس کی ماں نے جواب دیا۔

''تم تو تھے نہیں۔ نہ میں تھی اور نہ رشید۔ میں رشید کو لے کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ پھر یہ بے چاری کیا کرتی۔ دروازہ کھولنے تو جانا ہی پڑا۔ پھر اس میں کون سی آفت آ گئی۔ آخر دروازہ ہی تو کھولا بے چاری نے۔''

رمضان جُو کچھ بول ہی نہ پا رہا تھا۔ صرف آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اسے ایسا محسوس

ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کی بیٹی کو اس کے سامنے ننگا کر دیا ہو۔ وہ اپنے ماتھے پر بار بار دوہتڑ مارتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کی بیوی کو بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ اسے دلاسہ دینے لگی۔

''اس میں فرزانہ کا کیا قصور؟ یہ لوگ تو کمینے ہیں۔ ناپاک ہیں۔ ان لوگوں سے تو انگریز ہی بہتر تھے۔ اب چھوڑو ان باتوں کو۔ رات کا کھانا کھلا دو۔ مردود صبح ناشتہ کر کے چلا جائے گا۔''

رات کے نو بجے رمضان جُو نے ڈائننگ ہال میں ڈنر لگا دیا اور افضل کریم کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر ڈنر کا اشارہ کیا۔ دونوں میں مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ ڈنر ختم کر کے رمضان جُو نے سارے برتن جلدی سے سمیٹ لیے۔ عام طور پر وہ اپنے کوارٹر میں جانے سے پہلے مہمانوں کے کمرے میں جاتا تھا، ان کی ضرورتوں کے بارے میں دریافت کرتا تھا اور پھر شب بخیر کہہ کر رخصت ہو جاتا تھا مگر آج ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ سیدھے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

رات بھر رمضان جُو سو نہ سکا۔ بار بار اٹھ کر سجدے میں گر جاتا جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہو اور اب تائب ہونا چاہتا تھا۔ ادھر بیوی بھی بہت پریشان تھی۔ پوری رات اپنے خاوند کو دیکھتی رہی اور اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

صبح جب افضل کریم رخصت ہوا رمضان جُو اپنا بوریا بستر باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنے آبائی گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دن میں وہ دفتر جا کر اپنے افسر سے ملا اور اس کو اپنا استعفیٰ پیش کیا۔ افسر نے وجہ پوچھنا چاہی مگر رمضان جُو نے کچھ بھی نہ بتایا۔ البتہ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

تین روز کے بعد اس کی جگہ ایک نوجوان تعینات ہوا۔ رمضان جُو نے اسے گیسٹ ہاؤس کی چابیاں تھما دیں اور بال بچوں کو لے کر وہاں سے چل پڑا۔ جاتے وقت اس نے صرف ایک بار پلٹ کر اپنے گیسٹ ہاؤس پر، جس کو وہ عبادت گاہ سے کم نہیں سمجھتا تھا، نظر دوڑائی، ایک گہری آہ بھر لی اور پھر تیز تیز قدموں سے گیٹ کے باہر نکل گیا۔ ☆☆☆☆☆

زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا.....!

مارننگ واک سے واپس آ کر وہ اپنے باغ میں بید کی کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر سامنے پیڑ کے نیچے پڑے ہوئے شولنگ پر پڑی۔ وہ چونک گیا اور خیرگی کے عالم میں اپنی بیوی کو بلانے لگا۔

''شوبھا... شوبھا، اِدھر آؤ۔ دیکھو یہ سامنے پیڑ کے نیچے کیا پڑا ہے۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پیتل کا بنا ہوا یہ شولنگ وہاں کیسے پہنچ گیا۔

دریں اثنا ایک سن رسیدہ عورت جس کے بیشتر بال نقرئی تھے، اس کے سامنے حاضر ہوئی اور پوچھنے لگی۔

''کہو جی، کاہے کو بلایا۔ کوئی سانپ وانپ نکل آیا ہے کیا؟''

''اری نہیں، سانپ ہوتا تو کیا تجھے بلاتا۔ وہ دیکھو اس پیڑ کے نیچے کیا پڑا ہے۔''

وہ پیڑ کے قریب چلی گئی اور شولنگ کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''ہے بھگوان، یہ تو پیتل کا شولنگ ہے۔ ہم تو دھنیہ ہو گئے۔ مگر تعجب ہے یہ اِدھر کیسے پہنچا؟''

''کیا معلوم، کسی نے پھینک دیا ہوگا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ کوئی شولنگ کو پھینکنے کا دُساہس کر سکتا ہے کیا؟ مجھے تو شک ہو رہا ہے کہ بہو نے کہیں کوئی ٹونا ٹوٹکا نہ کیا ہو۔''

''ٹونا ٹوٹکا اور بھگوان کی مورتی سے۔ ان دو کا کیا سمبندھ! اس کے لیے تو مُردوں کی

ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کی بیٹی کو اس کے سامنے ننگا کر دیا ہو۔ وہ اپنے ماتھے پر بار بار دوہتڑ مارتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کی بیوی کو بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ اسے دلاسہ دینے لگی۔

''اس میں فرزانہ کا کیا قصور؟ یہ لوگ تو کمینے ہیں۔ ناپاک ہیں۔ ان لوگوں سے تو انگریز ہی بہتر تھے۔ اب چھوڑو ان باتوں کو۔ رات کا کھانا کھلا دو۔ مردود صبح ناشتہ کر کے چلا جائے گا۔''

رات کے نو بجے رمضان جو نے ڈائننگ ہال میں ڈنر لگا دیا اور افضل کریم کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر ڈنر کا اشارہ کیا۔ دونوں میں مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ ڈنر ختم کر کے رمضان جو نے سارے برتن جلدی سے سمیٹ لیے۔ عام طور پر وہ اپنے کوارٹر میں جانے سے پہلے مہمانوں کے کمرے میں جاتا تھا، ان کی ضرورتوں کے بارے میں دریافت کرتا تھا اور پھر شب بخیر کہہ کر رخصت ہو جاتا تھا مگر آج ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ سیدھے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

رات بھر رمضان جو سو نہ سکا۔ بار بار اٹھ کر سجدے میں گر جاتا جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہو اور اب تائب ہونا چاہتا تھا۔ ادھر بیوی بھی بہت پریشان تھی۔ پوری رات اپنے خاوند کو دیکھتی رہی اور اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

صبح جب افضل کریم رخصت ہوا رمضان جو اپنا بوریا بستر باندھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے اپنے آبائی گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دن میں وہ دفتر جا کر اپنے افسر سے ملا اور اس کو اپنا استعفیٰ پیش کیا۔ افسر نے وجہ پوچھنا چاہی مگر رمضان جو نے کچھ بھی نہ بتایا۔ البتہ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

تین روز کے بعد اس کی جگہ ایک نوجوان تعینات ہوا۔ رمضان جو نے اسے گیسٹ ہاؤس کی چابیاں تھما دیں اور بال بچوں کو لے کر وہاں سے چل پڑا۔ جاتے وقت اس نے صرف ایک بار پلٹ کر اپنے گیسٹ ہاؤس پر، جس کو وہ عبادت گاہ سے کم نہیں سمجھتا تھا، نظر دوڑائی، ایک گہری آہ بھر لی اور پھر تیز تیز قدموں سے گیٹ کے باہر نکل گیا۔ ☆☆☆☆☆

زمین پھوٹ کر جو بھگوان نکلا.....!

مارننگ واک سے واپس آ کر وہ اپنے باغ میں بید کی کرسی پر بیٹھ گیا اور چائے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر سامنے پیڑ کے نیچے پڑے ہوئے شِولنگ پر پڑی۔ وہ چونک گیا اور خیرگی کے عالم میں اپنی بیوی کو بلانے لگا۔

''شوبھا...شوبھا، اِدھر آؤ۔ دیکھو یہ سامنے پیڑ کے نیچے کیا پڑا ہے۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پیتل کا بنا ہوا یہ شولنگ وہاں کیسے پہنچ گیا۔

دریں اثنا ایک سن رسیدہ عورت جس کے بیشتر بال نقرئی تھے، اس کے سامنے حاضر ہوئی اور پوچھنے لگی۔

''کہو جی، کاہے کو بلایا۔ کوئی سانپ وانپ نکل آیا ہے کیا؟''

''اری نہیں، سانپ ہوتا تو کیا تجھے بلاتا۔ وہ دیکھو اس پیڑ کے نیچے کیا پڑا ہے۔''

وہ پیڑ کے قریب چلی گئی اور شولنگ کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھنے لگی۔

''ہے بھگوان، یہ تو پیتل کا شولنگ ہے۔ ہم تو دھنیہ ہو گئے۔ مگر تعجب ہے یہ ادھر کیسے پہنچا؟''

''کیا معلوم، کسی نے پھینک دیا ہوگا۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ کوئی شولنگ کو پھینکنے کا دُساہس کر سکتا ہے کیا؟ مجھے تو شک ہو رہا ہے کہ بہو نے کہیں کوئی ٹونا ٹوٹکا نہ کیا ہو۔''

''ٹونا ٹوٹکا اور بھگوان کی مورتی سے۔ ان دو کا کیا سمبندھ! اس کے لیے تو مُردوں کی

کھوپڑیاں اور ہڈیاں کام آتی ہیں۔''

''ہونہ ہو یہ زمین سے پھوٹ کر نکلا ہے۔ اور کوئی سمجھا ؤ نا ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن یہاں تو زمین کے شق ہونے کے کہیں آثار نظر نہیں آتے۔''

''کون جانے یہ پرکٹ ہوا ہے لیکن مجھے اس میں کوئی رہسیہ نظر آرہا ہے۔ باقی اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے۔''

شوبھا نے بڑی انکساری اور طہارت کے ساتھ شولنگ کو ساڑی کے پلو سے صاف کیا، پھر اسے نہلایا دھلایا، سیندور لگایا اور باغ سے پھول چن کر اس کی پوجا ارچنا کی۔ بہر کیف ذہن میں بار بار یہی سوال اٹھتا رہا کہ یہ لنگ یہاں پر کیسے نمودار ہوا۔

اتنی دیر میں نو بج گئے۔ ریوتی لال اگروال نے جلدی سے سنان کیا، کپڑے بدلے اور پھر چھڑی اٹھا کر ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔

''جلدی سے ناشتہ دو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ آج پھر کورٹ جانا پڑے گا۔ تاریخ پڑی ہے۔ نہ جانے میں نے پچھلے جنم میں کون سے برے کرم کیے تھے کہ سندر کی شادی اس گھر میں کر لی۔ ابھی بہو نے گھر میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ گھر جہنم بن کر رہ گیا۔ دراصل وہ سندر کو ہم سے چھین کر الگ رہنا چاہتی تھی مگر ناکام ہوئی۔ اسی لیے کورٹ میں ہم پر دہیج مانگنے اور یاتنائیں دینے کا الزام لگایا اور ساتھ ہی طلاق اور نان و نفقہ کے لیے درخواست دی۔''

''بھگوان کی جو مرضی۔ اس میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنی طرف سے لڑکی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شاید ہمارے نصیب میں یہی لکھا تھا۔''

''بہت ہو گیا۔ اب بہتر سال کی عمر میں اتنی دوڑ دھوپ نہیں ہو پاتی مجھ سے۔ خود سندر بھی ذہنی انتشار کے سبب بلڈ پریشر اور گیسٹرک السر سے جوجھ رہا ہے۔''

''چھوڑو جی ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ دل ہی کھٹا ہو جاتا ہے۔ ہاں ذرا راستے پر

سنبھل کر چلا کرو۔ آج کل راستوں پر بہت ٹریفک ہوتا ہے خاص کر کچہری روڑ پر۔''

ریوتی لال نے اپنی چھڑی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گیا۔

شوبھا دن بھر اسی سوچ میں غرق رہی کہ شولنگ اس کے گھر میں کیسے نمودار ہوا۔ دھیرے دھیرے اس کو یقین ہونے لگا کہ زمین پھوٹ کر ہی وہ نمودار ہوا ہوگا اور بعد میں زمین ہموار ہو چکی ہوگی تا کہ کسی کو کوئی شک نہ ہو۔ بھگوان کی مایا کو کون سمجھ سکتا ہے۔

ریوتی لال دن کے دو بجے گھر لوٹ آیا۔ وہ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود پھولے نہیں سما رہا تھا۔ آتے ہی شوبھا کو آواز دی اور مژدہ سنایا۔

''آج کورٹ نے ہمارے حق میں فیصلہ سنایا اور دعویدار پر جھوٹا مقدمہ دائر کرنے اور ہمیں پریشان کرنے کے عوض بیس ہزار روپے کا ہرجانہ لگایا۔ اگر سمدھی جی دو مہینے کے اندر بیس ہزار روپے کورٹ میں جمع نہیں کرے گا تو اسے دو مہینے کی جیل بھگتنی پڑے گی۔''

''ہے بھگوان، تمہارے کھیل ہی نرالے ہیں۔ میں نا کہتی تھی کہ آج ضرور کچھ ادبُھت ہونے والا ہے۔ بھگوان جی یوں تھوڑے ہی پرکٹ ہوگئے اور وہ بھی سویرے سویرے۔ یہ سب کرامات اسی کی ہیں۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بہت تنگ آ چکا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پاؤں۔''

''سنئے، اگر آپ میری بات مان لیں ہم اس جگہ پر شولنگ کی ستھاپنا کریں گے جہاں وہ پرکٹ ہوا اور اس کے اوپر ایک چھوٹا سا مندر بھی بنوائیں گے۔ شاید بھگوان کی یہی اِچھا ہو۔''

''بات تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں کل ہی کسی مستری سے بات کروں گا۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں کہیں کوئی ٹھاکر دوارہ نہیں ہے۔''

دوسرے دن مورتی نصب کرنے کا مہورت دیکھا گیا اور پیڑ کے نیچے ایک چھوٹا سا مندر

بنوانے کا آرڈر بھی دیا گیا۔ ریوتی لال کو یکا یک یہ احساس ہوا کہ مندر میں نصب کرنے کے لیے شولنگ بہت ہی چھوٹا پڑے گا اس لیے اس نے بازار سے سنگ مرمر کی ایک بڑی سی شو جی کی مورتی خرید لی۔ نصب کرنے کی شبھ گھڑی اتوار کے تین بجے مقرر ہوئی اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کو اس شبھ کاریہ کے لیے دعوت دی گئی۔

شوبھا اتوار کی صبح خود ہی ہمارے گھر نیوتا دینے کے لیے حاضر ہوئی۔ میں اس وقت ناشتہ کر رہا تھا۔ وہ اندر آئی اور میری بیوی ارچنا سے مخاطب ہوئی۔

''بیٹی، ہمارے گھر میں ساکھشات بھگوان پرکٹ ہوئے ہیں۔ آج دن کے تین بجے مورتی کی ستھاپنا ہوگی۔ البتہ ایک بجے سے بھجن کیرتن کا پروگرام ہے اور آخر میں بھوج ہوگا۔ بس دو ڈھائی گھنٹے کا کاریہ کرم ہوگا۔ آپ دونوں ضرور تشریف لائیں۔ ہم انتظار کریں گے۔''

ارچنا کے چہرے پر عجیب سی چمک پیدا ہوگئی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کر بھگوان کے درشن کر لے مگر دماغ نے اسے روک لیا۔ مجبوراً وہ شوبھا سے مخاطب ہوئی۔

''ٹھیک ہے آنٹی، میں ضرور آؤں گی۔ ان کے آفس میں آج پارٹی ہے اس لیے نہیں آسکیں گے۔'' ارچنا نے سراسر جھوٹ بولا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ میں ان چیزوں پر وشواس نہیں کرتا۔

پروگرام دن کے ایک بجے شروع ہونے والا تھا۔ ارچنا نے بارہ بجے ہی میرے لیے کھانا بنا کر رکھ دیا اور سج دھج کر پڑوسیوں کے ہاں چلی گئی۔ میں اس کی اس حرکت پر دل ہی دل میں ہنستا رہا اور حسب معمول ڈیڑھ بجے کھانا کھا کر بیڈ روم میں لیٹ گیا۔

ارچنا تقریباً پانچ بجے لوٹ آئی۔ بہت بپھری ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جو بھی سامنے آئے گا اسے کھا جائے گی۔ میں نے جونہی اس کے تیور دیکھے سامنا کرنا مناسب نہ سمجھا مگر وہ کہاں ماننے والی تھی مجھے گھور کر چلانے لگی۔

''دیکھا نتیجہ اپنی پاگل حرکتوں کا؟''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''یہی کہ چار دن پہلے جو شولنگ تم نے غصے میں آکر کھڑکی کے باہر پھینک دیا تھا وہ اکروال والوں کے ہاں جا گرا تھا۔ان کے باغ میں پیڑ کے نیچے پڑا تھا۔وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ زمین سے پھوٹ کر نکلا ہے۔''

ارچنا کا منہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

چار دن پہلے میں ارچنا کی توہم پرستی دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا تھا۔دراصل جتنی وہ آستک ہے اتنا ہی میں ناستک ہوں۔شادی کے بعد میں نے پندرہ برس اس کو کیسے جھیلا وہ میں ہی جانتا ہوں مگر وہ اس کو میری کمزوری سمجھنے لگی تھی۔

''آج جنم دن ہے ٹیکا کرنا اور جنئیو پہننا ضروری ہے......آج شوراتری ہے، رات بھر آپ کو پوجا میں شامل ہونا پڑے گا.......آپ کی پرموشن کے لیے میں نے منّت مانگی تھی اس لیے اشٹمی کے دن ہَون کرنا ضروری ہے......'' یہ سب کچھ سن کر میرے کان پک گئے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے میری سوچ وفکر پر حاوی ہونے لگی تھی۔ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے اب اپنے ڈھنگ سے جینے کا ادھیکار ہی نہیں ہے۔یہ چھوٹی چھوٹی باتیں لاوا کی مانند اندر ہی اندر جمع ہوتی رہیں اور آخر ایک دن پھوٹ کر باہر نکل آئیں۔بات یوں تھی کہ وہ اب ڈھونگی اور پاکھنڈی نجومیوں اور سوامیوں کے بہکاوے میں آکر نہ صرف پیسہ برباد کرنے لگی تھی بلکہ گھر کا چین بھی کافور ہو رہا تھا۔

اس روز غصے میں میں نے شولنگ کو اٹھا کر کھڑکی کے باہر بہت دور پھینکا تھا اور وہ دیکھتی رہ گئی۔اس وقت تک وہ نہ جانے کیا کیا بول رہی تھی مگر پھر اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی۔اسے گماں بھی نہ تھا کہ میں ایسا انتہا پسند قدم اٹھاؤں گا۔اس کی آنکھوں سے جھرنا بہنے لگی۔پھر وہ پلٹ کر

کمرے میں گھس گئی اور گھنٹوں سسکتی رہی۔ گھاؤ تو خیر وقت کے ساتھ مندمل ہو گیا مگر چنگاری دل میں سلگتی رہی۔

شام کو کھانے کی میز پر اسے رہا نہ گیا۔

''معلوم ہے آپ کی اس حرکت کا کیا نتیجہ نکلا؟''

''کیا نتیجہ نکلا، کچھ میں بھی تو سن لوں۔'' میں نے حیرت زدہ صورت بنا کر جواب دیا۔

''آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ اگروال والوں کی بہو نے نالش کی تھی۔ ان کے خلاف جھوٹ موٹ کا کیس دائر کیا تھا۔ بڑھاپے میں ان بے چاروں کی کیا حالت ہوئی ہوگی یہ آپ کیا جانیں۔ جس دن آپ نے ان کے گھر میں بھگوان پھینک دیا اسی دن کورٹ نے ان کے حق میں فیصلہ کر دیا اور ساتھ ہی دعویدار پر بیس ہزار روپے کا ہرجانہ ادا کرنے کا حکم بھی دے دیا۔''

''اوہ تو یہ بات ہے! میں بھی حیران تھا کہ تم لوٹتے سمئے اتنی خشمگیں کیوں نظر آ رہی تھی۔''

''آپ کو ہر بات میں دل لگی سوجھتی ہے۔ ان لوگوں کے وہم وگماں میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ وہ بھگوان میرے پاگل پتی دیو نے پھینک دیا تھا۔ انہیں پکا یقین ہے کہ وہ زمین سے پھوٹ کر ہی نکلا ہے۔''

''تم نے بتایا کیوں نہیں۔ اصلیت تو پتہ چل جاتی۔ اب وہ اسی بھرم میں رہیں گے کہ زمین پھٹ کر ان کے یہاں بھگوان نکل آیا ہے۔''

''ان لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ انہوں نے بازار سے مزید ایک سنگ مرمر کی مورتی خرید لی اور شولنگ کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ستھاپنا کی۔ اس جگہ پر چھوٹا سا مندر بھی بنوایا۔ اسی لیے ہَون کا اہتمام کیا گیا۔ کرتے کیوں نہیں! بھگوان نے صرف درشن نہیں دیے اتنا سارا فائدہ بھی تو پہنچایا۔ کبھی کبھی حقیقی دنیا سے فرار پا کر تصوراتی دنیا آباد کرنا زندگی کو تقویت بخشتا ہے۔ مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے کہ ان سے وہ خوشیاں چھین لیتی۔''

''دیکھا جائے تو انہوں نے ایک کام غلط کیا۔ ہمارے ہاں یہ بھگوان پندرہ سال سے براجمان تھا۔ غلطی سے کبھی کوئی انڈا بھی نہیں دیا۔ اب ایک جھٹکا کیا لگا بیس ہزار اُگل دیے۔ میرے خیال میں اس کو یوں بند کر کے نہیں رکھنا چاہیے بلکہ میری طرح اسے اور بھی دور پھینکنا چاہیے تا کہ کسی اور کے گھر میں مزید تیس چالیس ہزار چھوڑ دے۔'' میں اپنی ہنسی کو روک نہ پایا۔

''آپ کو نفسیات کے کسی ماہر کے پاس جانا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے آپ کا دماغی سنتلن بگڑ گیا ہے۔''

''چلو ساتھ ہی چلتے ہیں۔ تمہیں ڈاکٹری مشورے کی ضرورت مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ آج تک نہ وہ کسی ڈاکٹر کے پاس گئی اور نہ میں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ یقین ہے کہ میں ہی صحیح راستے پر چل رہا ہوں۔

اُدھر بھگوان نے بھی کوئی اور چمتکار نہیں دکھایا اور نہ ہی آج تک کوئی ایسی خبر ملی۔

☆☆☆☆☆

ترُ نڈ

بارہ برس کا تھا جب میری ماں مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد سارا گھر سونا سونا سا لگتا تھا۔ گھر سے کوئی ہنستی بولتی شئے غائب ہو جائے تو ہر سو ویرانی چھا جاتی ہے۔ چاروں جانب مہیب سایے منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ در و دیوار سے خوف، دہشت اور اضطراب چیڑ کے گوند کی طرح ٹپکتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے زبانوں پر تالے لگ چکے ہوں۔

سسکتی روحیں، تڑپتی سانسیں اور برستی آنکھیں......!

اسی ڈراونے پس منظر میں بلکتی میری چھوٹی سی جان۔ گھر میں میرے علاوہ تین بہنیں اور بھی تھیں۔ ایک بڑی اور دو مجھ سے چھوٹی۔

پتا جی صبح سویرے دفتر روانہ ہوتے اور دیر رات گھر لوٹتے۔ ہم چاروں بچے سکول سے واپس آ کر گھر میں دبک کر بیٹھ جاتے جب تک پاپا کے ہمبر سائیکل کی گھنٹی سنائی نہ دیتی۔ تب کہیں جان میں جان آ جاتی۔

چھ سات مہینے یوں ہی گزر گئے۔ ایک روز نہ جانے کیا ہوا۔ سارے شہر میں آندھی کی طرح خبر پھیلی کہ ایک بھیانک جانور 'ترُ نڈ' نے لوگوں کو دہشت زدہ کر دیا ہے۔ وہ جہاں بھی بچوں کو اکیلا پاتا ہے چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو باہر جانے سے روک لیتیں یہاں تک کہ سکول بھیجنے سے بھی کتراتیں۔ سکولوں، سڑکوں، باغیچوں اور کھیل کے میدانوں سے بچے غائب ہو گئے۔

زندگی میں پہلی بار میں نے آتنک کا سایہ اپنے ارد گرد منڈلاتے ہوئے محسوس کیا۔ ہر

چہرہ ڈر اور خوف کا اشتہار بن چکا تھا۔ کب کیا ہوگا کسی کو گماں بھی نہ تھا۔ بس سب ہونی کے انتظار میں بے بس ولا چار بیٹھے تھے۔

تُرنز.....! لکڑ بھگے کی شکل کا خونخوار درندہ.....! مُنحنی، مکروہ اور چالاک.....!

یہی قیافہ سب کی زبان پر تھا لیکن کسی نے خود دیکھا نہ تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی شکلیں تبدیل کر سکتا تھا۔ کبھی بلّی بن جاتا اور کبھی کُتا۔ ایسی افواہیں روز بروز گردباد کی مانند پھیلتی جا رہی تھیں۔ کوئی کہتا کہ وہ آج کل جنگلوں میں بے دھڑک پھر رہا ہے اور رات کی تاریکی میں بستیوں میں گھس کر بچوں کو اُٹھا لیتا ہے۔ کسی نے اخبار کے حوالے سے خبر دی کہ کل رات تُرنز نے سوگام میں دو بچوں پر بے دریغ حملہ کیا۔ چند نوجوانوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ ان کو زخمی کر کے بھاگ نکلا۔ پڑوس میں رہ رہی خدیجہ آنٹی ہم پر ترس کھا کر ہمارے گھر آئی اور اس نے ہمیں چوکنا کرنے کی غرض سے کہا۔

''بچو، آج کل ایک خونخوار جانور تُرنز سارے شہر میں دہشت پھیلا رہا ہے۔ وہ ننھے بچوں کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ دو روز پہلے اس نے وتری گام میں ایک بچے کو اٹھا لیا اور کوئی کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس لیے تم اکیلے گھر سے باہر کبھی قدم نہ رکھنا۔''

حیرت اس بات کی تھی کہ شہر میں کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو وثوق سے کہتا کہ اس نے تُرنز کو دیکھا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ تُرنز کے سامنے سبھی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ حکومت کچھ نہیں کر پا رہی تھی، پھر نہتے مجبور لوگوں سے آس لگانا کہاں کی دانشمندی تھی۔ کم سن ہونے کے سبب ہم کسی سے یہ بھی نہیں پوچھ پاتے تھے کہ خود کو کیسے محفوظ کر لیں۔ بس پتا جی کا انتظار کرتے کرتے آنکھ لگ جاتی اور صبح جو آنکھ کھلتی تو پتا جی دفتر جانے کی تیاری میں ہوتے۔ اس وقت ان سے کوئی بات کرنا فضول تھا۔

ایک روز ہم سب سکول سے آ کر رسوئی میں بیٹھے پاپا کا انتظار کر رہے تھے۔ دراصل

ہماری رسوئی کے دو حصے تھے۔ ایک جہاں کھانا پکایا جاتا تھا اور دوسرا جہاں چوبی تخت بچھا ہوا تھا جس پر ہم سب دوزانو بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ سورج کچھ دیر پہلے ہی ڈوب چکا تھا۔ بڑی بہن کو یاد آیا کہ اسے دیا جلا کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھنا ہے۔ اسے پتا جی نے سمجھا رکھا تھا کہ ماں سورگ لوک کی جانب لمبے سفر پر نکلی ہے۔ اس لیے اس کے راستے کو روشن کرنے کے لیے سندھیا کے سمئے دیا جلانا ضروری ہوتا ہے۔ وہ اٹھی، دیا روشن کیا، اسے کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیا اور پھر چائے بنانے کے لیے اسٹوو جلانے لگی۔

میں تخت پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ باہر اندھیرا بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ الیکٹرک بلب کی اُکتا دینے والی پھیکی زرد روشنی سے دل مایوس ہو چکا تھا حالاں کہ دیے کی روشنی نے اجالے میں تھوڑا بہت اضافہ کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے دیا ٹمٹمانے لگتا اور میرے من میں طرح طرح کے سوال اٹھتے۔ اگر دیا بجھ گیا تو پھر کیا ہوگا؟ کہیں اندھیرے میں ماں بھٹک تو نہ جائے گی؟ اگر راستہ بھول گئی تو سورگ لوک میں بھگوان جی سے کیسے ملے گی؟ میں اندر ہی اندر وہ سارے منتر پڑھنے لگا جو مجھے یاد تھے۔

چھوٹی بہنیں سامنے لیٹی اونگھ رہی تھیں۔ انہیں سردی سے بچانے کے لیے میں نے سوچا کہ دوسرے کمرے سے کمبل لا کر ان پر ڈال دوں۔ جونہی میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی میری نظر سامنے دروازے پر پڑی جہاں ایک خونخوار بلّی مستعدی کے ساتھ میرا انتظار کر رہی تھی۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ ترُند بھی بلّی کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ میری شریانوں کا پورا خون سوکھ گیا۔ اب میری ٹانگیں میرا بوجھ اٹھا نہیں پا رہی تھیں۔ سہم کر میں واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا اور اپنی بڑی بہن کو اشارے کرنے لگا کہ دروازے پر ترُند کھڑا ہے۔

موت کو سامنے دیکھ کر میری ہوائیاں اُڑ گئیں۔ دیدی کا چہرہ بھی زرد پڑ چکا تھا۔ ہم دونوں مسلسل بلّی پر نظر رکھے ہوئے تھے اور بلّی تھی کہ بنا آنکھ جھپکائے ہمیں گھور رہی تھی۔ نہ میرے حلق

سے بات نکل رہی تھی اور نہ ہی میری بہن کے حلق سے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ کہیں اس کو ہماری کوئی حرکت ناگوار گزری تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اب تک تو خیر تھی کہ وہ کسی پر جھپٹی نہیں لیکن ہماری گفتگو سے ہو سکتا ہے کہ اسے غصہ آئے اور وہ ہم پر حملہ کرے۔ بہتر یہی تھا کہ بنا کسی حرکت کے ہم یوں ہی بیٹھے رہیں اور اسے ایسا کوئی موقعہ نہ دیں جسے وہ ناراض ہو جائے۔ ہمارے کچّے ذہن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں سوچ سکتے تھے۔

سیاہ پس منظر میں بلّی کی آنکھیں مسلسل چمک رہی تھیں۔ ہوا چلنے کی سر سراہٹ بھی اسے چوکنا کر دیتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے کہ پہلے کس کو کھالوں۔ مجھے یا میری بہن کو؟

میں اس کی تقلیب ماہیت کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ جانے کس دم وہ بلّی کی جون سے نکل کر واپس ترُند کی صورت اختیار کر لے۔ پھر میں نے خود سے سوال کیا کہ آخر ترُند کو ہمیں کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم نے تو اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑا۔ پھر وہ ہم پر کیوں حملہ کرنا چاہتا ہے؟

اندر سے آواز آئی۔ ''بھلا ترُند کو اس سے کیا مطلب کہ تم نے اس کو نقصان پہنچایا یا نہیں۔ نہتّے لوگوں کو نوالہ بنانا اس کی فطرت ہے۔ اسے اپنی بھوک مٹانے سے غرض ہے۔ وہ چاہے جس طرح بھی مٹ سکے۔''

میری چھوٹی بہنیں دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھیں۔ اِدھر اسٹوو پر چائے ابل رہی تھی اور اُدھر دیدی برتن اتارنے کی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھی۔ وہ بھی زندگی اور موت کے درمیان پنڈولم کی طرح جھول رہی تھی جس کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہو رہے تھے۔ بے کس و لاچار وہ میری جانب بار بار دیکھ رہی تھی۔ حالاں کہ میں اس سے چھوٹا تھا مگر تھا تو مرد ذات۔

اچانک میری نظر کھُلی ہوئی کھڑکی پر پڑی۔ میں نے چھلانگ لگا کر باہر کود جانے کا فیصلہ کر لیا تا کہ مدد کے لیے پڑوسیوں کو بُلا لوں۔

''عین ممکن ہے کہ ترِ نذ میرا تعاقب کرے اور مجھے دبوچ لے۔'' میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا۔

''مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں بھاگنے میں کامیاب ہو جاؤں اور ہمسایوں کو بلا کر لا سکوں۔ ایک تو جان بچ جائے گی اور دوسرے میری بہنوں کو بچانے کے لیے لوگ چلے آئیں گے۔ ..... دوسری صورت یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ وہ مجھے نظر انداز کر کے میری بہنوں پر جھپٹ پڑے۔..... مگر ایسی صورت میں ممکن ہے کہ پڑوسی میری بہنوں کو زخمی حالت میں ہی سہی لیکن چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں۔'' میرا ذہن سوال و جواب کا اکھاڑہ بن گیا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ سے کھڑکی کے باہر کود گیا اور مدد کے لیے پڑوسیوں کو پکارنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ کچھ لوگ بلّم اور لوہے کی سلاخوں سے لیس تھے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے ہمارے مکان کی طرف بڑھنے لگے۔

بلّی کی نظر جونہی ہجوم پر پڑی وہ گھبرا گئی اور بڑی پھرتی سے سیڑھیوں کے راستے چھت کی طرف بھاگ گئی۔ کچھ آدمی گھر کے اندر گھس گئے، دونوں سوتے ہوئے بچوں کو گود میں اٹھالیا جبکہ میں نے دیدی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھالیا اور اپنے ساتھ باہر لے آیا۔

اس کے بعد ہم سب بھائی بہن پڑوسی کے گھر میں بے صبری سے اپنے پاپا کا انتظار کرتے رہے کہ کب وہ آئے گا اور ہمیں واپس اپنے گھر لے جائے گا۔ گھر کتنا بھی غیر محفوظ کیوں نہ ہو، آخر گھر تو گھر ہی ہوتا ہے۔

انتظار کا وہ ایک ایک لمحہ ہمیں ایک ایک برس کے برابر لگ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

زندگی سوچ کر اداس ہو گیا میں

اس روز میں اور میری بیوی شکنتلا کرنل چودھری کے یہاں کال آن کرنے پہنچے تو اس کے بیٹ مین نے دروازہ کھولا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک ننھا منا لڑکا کمرے میں آ کر ہمیں ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔

سہما سہما، ڈرا ڈرا، الجھے ہوئے بال، ناک سے رینٹ بہتی ہوئی۔ لگتا تھا اس نے اپنی آنکھوں میں سارے جہاں کا غم سمیٹ لیا ہو۔

شکنتلا پہلی ہی نظر میں اس بچے پر فریفتہ ہو گئی۔ ہوتی کیسے نہیں جس کی اپنی گود سونی ہو وہ بچے کی قدر کیوں نہ کرے۔ اس نے بچے کو اپنے پاس بلایا، ہینڈ بیگ سے اپنی رومال نکالی، بچے کی ناک صاف کر لی اور انگلیوں سے اس کے بال سنوار لیے۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ چپ چاپ اس کی گود میں بیٹھ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بولنا چاہتا ہے مگر بول نہیں پا رہا تھا۔

اتنی دیر میں کرنل صاحب اور اس کی شریمتی جی کمرے میں داخل ہو گئی۔ بچے کو شکنتلا کی گود میں دیکھ کر رنجنا غرّائی۔ ”رِنکو، پھر وہی بات۔ تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ جب گھر میں مہمان آئیں تو ڈرائینگ روم میں مت آیا کرو۔ گو اینڈ ڈو یوور ہوم ورک۔“ پھر وہ بلرام سے مخاطب ہوئی۔ ”اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔“

رِنکو گڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چہرے پر مایوسی اوڑھے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے بچپن ہی میں تنہائی سے سمجھوتا کرنا سیکھ لیا تھا۔

بلرام ٹرے میں وہسکی بھرے گلاس، آئس بکٹ، سوڈا اور پانی لے کر ایک ایک کر کے

مہمانوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سبھی نے اپنا اپنا جام اُٹھا کر چیئرس کا بلند نعرہ لگایا اور پھر وہسکی پینے میں محو ہو گئے۔ شراب گھونٹ گھونٹ میرے حلق سے نیچے اترتی گئی اور اس کے ساتھ ہی بچے کی شبیہہ بھی دھندلی پڑتی گئی۔

کچھ وقفے کے بعد ایک اور بچہ، جو پہلے بچے سے عمر میں قدرے چھوٹا تھا، ٹرائیسکل پر سوار کمرے میں داخل ہوا اور میز پر رکھے ہوئے کاجوؤں پر پل پڑا۔ رنجنا کے چہرے پر عجیب سی مسرت پھیل گئی۔ اس نے دو تین کاجو ہاتھ میں اٹھا لیے اور ننھے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ پھر بیٹ مین کو پکارا۔ ''بلرام، دیکھو بابا کو گارڈن میں تھوڑی دیر گھما لاؤ۔''

بلرام نے جھٹ پٹ حکم کی تعمیل کی اور ٹرائیسکل پر سوار بچے کی انگلی پکڑ کر اس کو اپنے ساتھ باغ میں لے گیا۔

میں اور شکنتلا ایک دوسرے کو تعجب سے تکتے رہے۔ اس کے ذہن میں بھی وہی سوال اٹھا تھا جس نے میرے ذہن کو کلبلایا تھا۔ ایک ماں دو بچوں کے بیچ اتنا فرق کیسے کر سکتی ہے؟ پہلے والے کو اس نے دھتکار دیا اور دوسرے کو کلیجے سے لگا لیا۔ اس میں کوئی رہسیہ ضرور ہو گا۔

انسان دراصل اپنی جبلت کا قیدی ہوتا ہے۔ ممتا اور خون کی سرحدیں اس کو شیطان بنا دیتی ہیں۔ اس بات کا انکشاف تب ہوا جب اتفاقاً ہماری ملاقات ٹرانزٹ کمپ کے ڈائننگ ٹیبل پر کرنل چودھری کے رفیقِ کار کرنل شیام سندر سے ہوئی۔ وہ میڈیکل کور ہی میں گائنیکالجسٹ تھے۔ اس نے ہمیں بتایا کہ رِنکو کرنل چودھری کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے جو دس سال پہلے کچن میں گیس کے رِساؤ کے باعث جل کر مر گئی تھی۔

''مر گئی یا ماردی گئی۔'' مجھ سے رہا نہ گیا، جھٹ پوچھ بیٹھا۔

''کون جانے سچ کیا ہے۔ پولیس نے تو ایکسیڈنٹ بتا کر کیس بند کر دیا۔ پھر دوسرے ہی برس چودھری نے ایک ملٹری نرسنگ افسر کیپٹن رنجنا سے شادی کر لی جو عمر میں اس سے بہت چھوٹی

تھی۔ وہ پہلے ہی دن سے سوتیلے بچے سے نفرت کرنے لگی۔ شادی کے دو سال بعد اس نے خود بھی بَیس ہسپتال میں ایک بچے کو جنم دے دیا۔ سننے میں آیا ہے کہ ان دونوں میں کافی اَن بَن رہتی ہے اور رنجنا اس کا غصہ سوتیلے بیٹے پر بیدردی سے اتارتی ہے۔"

"ظاہر ہے رنجنا کو شادی سے قبل پہلی بیوی اور بچے کا علم رہا ہوگا۔ پھر وہ کس بات پر خفا رہتی ہے؟"

"سوتیلا بچہ ہر عورت کی آنکھ میں کھٹکتا ہے۔ یہ تو اس کی فطرت ہے۔ وہ اسے استعمال شدہ مرد کی یاد دلاتا ہے۔"

"مگر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔ ماتا بھی تو کوئی معنی رکھتی ہے۔"

"یگوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ رام چندر جی کو سوتیلی ماں کی وجہ سے بن باس جانا پڑا تھا۔ پھر ہماری کیا اوقات۔"

بات آئی گئی ہوگئی۔ شکنتلا اور میں نے بار ہا سوچ لیا کہ کرنل چودھری کے گھر جائیں اور اسے اس کا بیٹا رِنکو مانگ لیں۔ بے چارے کو مصیبت سے چھٹکارا مل جاتا۔ لیکن ہر بار یہ سوچ کر قدم رک جاتے کہ کہیں وہ برا نہ مان لے اور دھکے مار کر ہمیں گھر سے باہر نہ نکال دے۔

وقت کی دھارا یوں ہی بہتی گئی اور ہم شہر شہر بستی بستی گھومتے رہے۔ کبھی ایک جگہ ٹرانسفر ہو جاتا اور کبھی دوسری جگہ۔ گزشتہ برس میری پوسٹنگ بریلی ہوئی۔ مجھے میڈیکل چیک اپ کرانے ہسپتال جانا پڑا۔ وہاں کرنل شیام سندر سے ملاقات ہوئی جو اب برگیڈیئر بن چکے تھے۔

"ہیلو برگیڈیر شیام، ہَو آر یُو۔ آپ کو ترقی ملی ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔"

"تھینک یُو۔ آپ نے بھی تو رینک پک اپ کی ہے، برگیڈیر آشوتوش۔ کانگریٹس"

"شکریہ۔ پچھلے سال ہی ترقی پائی۔ وہاٹ اَباوٹ کرنل چودھری۔ ان کی کچھ خبر؟"

"اوہ، آپ کو معلوم نہیں۔ ہی میٹ اینڈ رٹریجڈی لاسٹ ائیر۔ اس کی دوسری بیوی بھی

گیس سے جل کر مر گئی۔''

''ایکسیڈینٹ یا خودکشی؟'' میں نے وہی پرانا سوال پھر دہرایا۔

''بھگوان جانے! ایکسیڈنٹس ڈونٹ ریپیٹ دیم سیلوز۔ میں بھوت پریت پر بھی یقین نہیں کرتا ورنہ سوچتا اس کے گھر پر کسی بھوت کا سایہ ہے۔ دیئر مسٹ بھی سم تھنگ فشی۔'' اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

''اس کا وہ دوسرا بچہ؟ وہ تو ابھی چھوٹا ہی ہوگا؟''

''ہاں، بے چارا.....! تیسری ماں کا انتظار کر رہا ہے۔''

گھر پہنچتے ہی میں نے یہ بُری خبر شکنتلا کو سنائی۔ ''معلوم ہے شگن۔ وہ تھا نا.....وہ.....کرنل .....سوری بریگیڈیر شیام سندر۔''

''ہاں اسے کیا ہوا؟'' وہ اچھل پڑی۔

''اری، اسے کچھ نہیں ہوا۔ اس نے بتایا کہ کرنل چودھری کی دوسری بیوی بھی گیس سے جل کر مر گئی اور اب اس کے دونوں بچے بن ماں کے رہ گئے ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں فطری انصاف۔ اب دوسرا بچہ بھی ماں کے پیار کے لیے ترسے گا۔''

''چھی...چھی...ایسی باتیں نہیں کرتے۔ آپ کے منہ سے ایسی بھاشا شوبھا نہیں دیتی۔'' شکنتلا کی ماتا ابل پڑی۔ ''اس میں اس بے چارے معصوم بچے کا کیا قصور؟ اس کی ماں کی غلطیوں کا خمیازہ وہ کیوں بھگتے؟ بھگوان بھی کتنا نردئی ہو گیا ہے آج کل۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو بے سہارا چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں میں ہوں کہ بچے کی کلکاری سننے کے لیے کب سے ترس رہی ہوں۔ خیر جو اس کی اِچھا۔ اس کی مرضی کو کون ٹال سکتا ہے۔''

شکنتلا کی باتیں سن کر میں فکر و تردد کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ مجھے اپنے آپ پر گھن سی آنے لگی۔ ندامت کے باعث مجھے اپنی بیوی کی نظروں سے نظریں ملانے میں جھجھک سی محسوس

ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کچن سے کافی بنا کر لے آئی۔ آخر کار میں نے ہمت کر کے اس کے چہرے پر نظر ڈال دی۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں لال ڈورے صاف نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ کچن میں جی بھر کر روئی تھی۔

☆☆☆☆☆

بے نسب ورثے کا وجود

بوڑھا سیموئل لنک روڈ کے پاس آٹو رکشا سے لاٹھی ٹیکتا ہوا اترا اور بہت دیر تک حیرت و بے بسی سے چاروں جانب دیکھتا رہا۔ پھر سڑک کی دائیں طرف جا کر ایک بڑی چٹان پر بیٹھ گیا۔

آج وہ بھولی بسری یادیں تازہ کرنے کے لیے اس طرف نکل آیا تھا۔ اس کے چہرے کی بے شمار شکنیں بے کسی اور اندرونی انتشار کا اشتہار بنی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں پیدا ہوئے خلا کا علاج نہیں ڈھونڈ پا رہا تھا۔ کہاں تو وہ اس بات پر یقین کرتا تھا کہ جب دودھ باہر مل جاتا ہے تو گھر میں کھونٹے سے گائے باندھنے کی ضرورت کیا ہے اور کہاں اب یہ حال تھا کہ اس کی تنہائی اسے ہر لمحے ڈس رہی تھی۔ نہ آگے کوئی تھا نہ پیچھے۔ جوانی میں یار دوستوں کا مجمع رہتا لیکن اب وہ سامنے بھی نہ پھٹکتے تھے۔ سب اپنی اپنی گرہستی کا بہانہ بنا کر عدیم الفرصتی کا رونا روتے۔ اب صرف سیموئل تھا اور اس کی چار دیواری جس میں وہ اپنی سانسیں گن رہا تھا۔

سیموئل ممبئی جیسے بڑے شہر سے نامراد لوٹ آیا تھا۔ اسے وہ شہر راس نہیں آیا۔ جہاں دیکھو وہاں اجنبی لوگ، مکھوٹے لگائے چہرے اور ناپائدار رشتے۔ ہر قدم پر جونکیں، ہر قدم پر دھوکا۔ بھیڑ اتنی کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے، لوکل میں کھڑے رہو تو ایک دوسرے کی سانس اندر لینی پڑتی ہے۔ لوگ آپس میں خوشیاں نہیں، جراثیم بانٹتے ہیں۔ سانسوں کے ذریعے، سڑک پر پاؤ باجی کے ساتھ یا پھر منشیات کی سوئیوں میں بھر کر۔ اس نے کئی بار یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ اس شہر میں ایسا کیا تھا جو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں پہنچ گیا مگر قدم قدم پر اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

خیر اب وہ لوٹ آیا تھا۔ زندگی کے باقی ماندہ دن گزارنے کے لیے۔ اس نے اپنی

سلیٹ بالکل صاف کر رکھی تھی۔ زندگی بھر جو کچھ اس نے سلیٹ پر لکھا گذشتہ ایک سال میں وہ سب مٹ چکا تھا۔ جوانی میں جو کچھ کمایا وہ ایتھر کی مانند سب اڑ چکا تھا۔ اس شہر میں فقط ایک چھوٹا سا گھر نما کمرہ بچا تھا سو وہ بھی حال ہی میں بک گیا۔

چٹان پر بیٹھ کر وہ جس خطۂ زمین کو گھور رہا تھا اس پر کسی زمانے میں لیونارڈ پٹرول اسٹیشن ہوا کرتا تھا جہاں وہ جوانی کے ابتدائی دنوں میں آتی جاتی گاڑیوں میں پٹرول بھرا کرتا۔ چند برس بعد حکومت نے شہر میں ٹریفک کم کرنے کی غرض سے اس پٹرول اسٹیشن کو ہٹا دیا تھا۔ اسٹیشن کے احاطے کے اوپر سے ایک لنک روڈ نکالی گئی جو پانچ کلومیٹر آگے جا کر دوبارہ شاہراہ سے مل رہی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ جن دو پٹرول ڈسپنسر پمپوں کے سامنے گاڑیاں کھڑی ہو جاتی تھیں وہ انہدام کی زد میں نہیں آئے۔ دونوں متروک فیوئل ڈسپنسر، دھول اور مٹی میں اٹے ہوئے، اب بھی خاموش اداسی کے ساتھ اپنے اندر تباہی کی داستاں سمیٹے وقت کی تباہ کاریوں کا مقابلہ کر رہے ہیں حالانکہ ان کا استعمال کب کا بند ہو چکا تھا۔ آج سیموئل چٹان پر بیٹھا ان پمپوں کو بار بار دیکھ کر اپنی گزری ہوئی زندگی کو کریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کتنی مماثلت تھی ان پمپوں اور اس کی اپنی زندگی میں! وہ سوچتا رہا اور اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیلتی رہی۔ اب نہ وہ پٹرول پمپ تھا اور نہ ہی وہ زندگی۔ سب کچھ بدل چکا تھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے وہی پرانے پٹرول اسٹیشن کا نظارہ گھومنے لگا۔ ایک کے بعد ایک گاڑیاں چلی آتیں، پٹرول ڈسپنسر کے سامنے رُک جاتیں اور وہ لپک کر ٹنکی کا ڈھکن کھول دیتا، ڈسپنسر پمپ میں لٹکا ہوا فیوئل نوزل نکال کر اس میں ڈال دیتا اور ٹنکی بھر جانے تک انتظار کر لیتا۔ قیمت ادا ہونے کے بعد گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔ ان دنوں یہ نظارہ اس کے لیے معمول بن چکا تھا۔ موٹر، جیپ، سکوٹر، موٹر سائیکل، لاری، ٹرک...! طرح طرح کی گاڑیاں اور طرح طرح کے میک۔ کسی کو پٹرول اور کسی کو ڈیزل کی ضرورت ہوتی۔ سب کی نظریں

ڈسپنسر پمپ کے میٹر پر لگی رہتیں۔ سیموئل کے خوبصورت چہرے یا کسرتی بدن کی طرف کوئی بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ کبھی کبھار شاہراہ بند ہو جانے کی وجہ سے ٹریفک کی آوا جائی بند ہو جاتی اور اس کو گھنٹوں گاڑیوں کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس وقت سیموئل کو سوچنے کا موقعہ مل جاتا۔ اس کو اپنا وجود بے معنی سا لگتا۔ رفتہ رفتہ ہونے اور نہ ہونے کا احساس بھی ختم ہو گیا اور اس کو خود سے گھن آنے لگی۔

اسے یاد آیا کہ کیسے چھوٹی عمر میں ہی اس کو پٹرول اسٹیشن پر نوکری مل گئی تھی حالانکہ اس کے پاس تعلیمی سند تھی نہ تکنیکی مہارت۔ کام زیادہ پیچیدہ بھی نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ ابتدا میں تھوڑی بہت مشکل پیش آئی لیکن آہستہ آہستہ اس نے سارا کام سیکھ لیا۔ اس کے لیے خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ نزدیکی گرجا گھر کا پادری اس کے گٹار بجانے سے بہت متاثر تھا اور کبھی کبھی کمیونٹی پروگراموں کے لیے اس کو بلا لیتا۔ راہب کو سیموئل کی یتیمی پر ترس آ گیا تھا۔ اس لیے اپنے اثر ورسوخ سے پٹرول اسٹیشن کے کرسچن مالک کے پاس اس کی سفارش کی تھی۔ سیموئل نے جب یہ خبر سنی تو خوشی سے پھولا نہ سمایا اور جھومتا ہوا واپس گھر چلا گیا۔ گھر کیا تھا، گندی بستی میں ایک بڑا سا کمرہ، جو اس کی ماں، جس نے یتیم خانہ سے اس کو گود لیا تھا، اس کے لیے چھوڑ کر خدا کے پاس چلی گئی تھی۔ سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سب اسی کمرے میں ہوتا تھا البتہ حاجات ضروریہ کے لیے بستی کے مشترکہ بیت الخلا اور غسل خانے میں جانا پڑتا تھا۔

سیموئل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی زندگی رائیگاں ہو رہی ہے۔ وہ اس زندگی سے فرار چاہتا تھا۔ گو اس کے پاس کوئی خاص تعلیم و تربیت کی سند نہ تھی پھر بھی اس کو اپنے کسرتی بدن اور خوبصورت چہرے پر ناز تھا جس کے سامنے بڑے بڑے ماڈل شرما جاتے۔ سو اس نے ہمت کر کے ممبئی جانے کی نیت باندھی اور دوسرے ہی روز بوریا سنبھال کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ لیکن وہاں اس کے انتظار میں کوئی رشتے دار تو بیٹھا تھا نہیں جو اس کو ماڈل بنا دیتا۔ جوتا گھستے گھستے کئی مہینے گزر گئے مگر ہاتھ کچھ نہ آیا۔ پیٹ نے بہت ستایا حالانکہ اس کا کرسچن تعلق اور گٹار یہاں بھی تھوڑا بہت

کام کر گیا پھر بھی ممبئی جیسے شہر میں پیٹ پالنے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہوتا۔

ایک روز گلوب ایڈورٹائزرس کے آفس سے نکل کر سیموئل فکر و تردد کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا میرین ڈرائیو پر بے سمت چلا جا رہا تھا۔ شفق کی سرخی سمندر کے پانیوں میں حلول ہو کر جوش مستی میں سرشار کسی دوشیزہ کا چہرہ معلوم ہو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے میرین ڈرائیو کے گلوبند پر جڑے قمقمے جگمگا اٹھے تھے۔ ہر شام کی طرح آج بھی فضا رومانی لگ رہی تھی۔ بہت دور چل کر سیموئل کو کچھ تھکن سی محسوس ہوئی اور وہ ایک کھمبے کے سہارے کھڑا ہو کر سگریٹ پینے لگا۔ سامنے سے فراٹے بھرتی ہوئی ایک مرسڈیز اس کے ٹھیک سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے زور کا جھٹکا لگا اور وہ دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ پٹرول پمپ، نہ فیوئل نوزل اور نہ ہی منیجر صاحب کا کیبن۔ پھر یہ کار اس کے سامنے کیوں رک گئی؟ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کار کا دروازہ کھل گیا۔ کوئی حسینہ، جو کار ڈرائیو کر رہی تھی، اس کو کار کے اندر آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کو بلا رہی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا شاید کسی اور کو اشارہ کر رہی ہو مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پھر ہمت کر کے اس نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے بلا رہی ہیں؟ حسینہ نے سر ہلا کر ہامی بھر لی اور اس کو کار میں آنے کی دوبارہ دعوت دی۔

وہ تھوڑی دیر رُکا رہا۔ پھر ہمت بٹور کر کار کے اندر جا بیٹھا۔

شیریں نے اپنی ساڑی سمیٹ لی اور مسکرا کر کہنے لگی۔ ''ہیلو، کیسے ہو؟''

وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ایک اجنبی عورت کا یوں بلانا، پھر کار میں بٹھانا اور پوچھے بغیر کار چلانا، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ لمبی سی سانس کھینچ کر اس نے جواب دیا۔ ''بس ٹھیک ہوں۔''

شیریں یہی کوئی تیس پینتیس سال کی عورت تھی۔ تھل تھل کرتا ہوا گورا بدن، سڈول بازو، شانوں تک ترشے ہوئے بال، ہلکی لال رنگ کی لپ اسٹک لگے مخروطی ہونٹ، کانوں میں لمبے ہیرے جڑے آویزے، ارغوانی نیل پالش سے رنگے لمبے لمبے ناخن؛ پیازی ساڑی اور ملتا جلتا لو

کٹ سلیولیس بلاؤز جس میں سے ابلتی ہوئی چھاتیاں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ سیموئل کی نظریں لمحہ بھر کے لیے ان پر جا پڑیں مگر جلدی ہی جھک گئیں۔ شیریں، جو کن انکھیوں سے اس کو دیکھ رہی تھی، کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر کچھ نہ بولی۔ سفر خاموشی کے ساتھ کٹ گیا اور آخر کار شیریں نے اپنی کار ایک عالیشان بنگلے کے اندر پورچ میں روک لی۔ پھر سیموئل سے مخاطب ہوئی۔

''آؤ، اندر چلیں۔ یہ میرا گھر ہے۔''

سیموئل نے اپنی چاروں جانب نظریں گھمائیں۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے عالیشان بنگلے میں داخل ہو رہا ہے۔ ہچکچاتے ہوئے اس نے قدم آگے بڑھائے اور شیریں کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ شیریں اس کو سیدھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی اور صوفے پر بٹھا دیا۔ پھر وائن کیبنٹ کھول کر وہسکی سے دو جام بھر لیے اور ان میں سے ایک سیموئل کو پیش کیا۔ ساسیجز، کاجو، اخروٹ اور بادام بھی سامنے رکھ دیے۔ سیموئل وہسکی کی چسکیاں لیتا رہا۔ دریں اثنا شیریں نے وارڈ روب سے اپنا شب خوابی نکالا اور ملحق باتھ روم سے کپڑے بدل کر آ گئی۔ اس نے اپنا میک اپ درست کر لیا تھا اور شعلۂ شب تاب لگ رہی تھی۔ سیدھے آ کر سیموئل کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے جام سے جام ٹکرایا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں دیر تک جھولتے رہے۔

صبح سیموئل شکن آلود بستر سے بہت دیر سے جاگ اٹھا مگر شیریں اپنے دفتر جا چکی تھی۔ نوکرانی نے آ کر اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھما دیا اور ناشتہ کرنے کے لیے ڈائننگ روم میں بلایا۔ لفافے میں سے ایک خط برآمد ہوا جس میں لکھا تھا۔ ''میں نے تم کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ تم رات کے تھکے ہوئے تھے اور گہری نیند سو رہے تھے۔ میں دفتر جا رہی ہوں۔ تمھارے لیے سرہانے کے نیچے دس ہزار روپے رکھے ہیں۔ ناشتہ کر کے چلے جانا۔ آنے والی سنیچر کو پھر ملیں گے۔''

سیموئل کو تعجب ہوا۔ اس نے دس ہزار کی گڈّی جیب میں ٹھونس دی، منہ ہاتھ دھو لیا اور پھر ناشتہ کر کے چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ سوچنے لگا کہ اچھا دھندہ ہے۔ شب گزاری کے دس ہزار!

اس کے بعد کئی شب یوں ہی گزر گئے۔ اس کو احساس ہوا کہ یہ سب کرشمہ اس کے کسرتی بدن کا ہے۔ سیموئل نے اپنے پنکھ مزید پھیلا دیے کیونکہ شیریں کے ساتھ اس کی ملاقات صرف سنیچر کو ہوتی تھی اور وقت کے ساتھ اس کی ضرورتیں بڑھنے لگی تھیں۔ شیریں بھی سیر ہو کر اس سے دھیرے دھیرے کترانے لگی تھی۔ ادھر سیموئل ماڈلنگ میں کوئی خاص ترقی نہیں کر پایا۔ بس یہی کسی پان بیڑی کے اشتہار کے واسطے لوگ اس کو بلاتے تھے۔ بہر حال زندگی جیسے تیسے گزر رہی تھی۔

ہر روز نئی خوشبو، نیا لمس اور نیا تجربہ۔ اور زندگی میں چاہیے بھی کیا؟ حال سے آدمی مطمئن ہو تو وہ مستقبل کی فکر کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ سیموئل اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ البتہ اتوار کو گرجا گھر جانا کبھی نہ بھولتا۔ وہاں شکریہ کے دو بول پڑھ کر واپس چلا آتا۔

پھر ایک روز اس کی زندگی میں طوفان آ گیا۔ وہ کئی روز بخار سے تپتا رہا اس لیے کرسچن چیرٹی ہسپتال پہنچ گیا۔ وہاں ڈاکٹر نے کئی ٹیسٹ کروائے اور آخر میں یہ منحوس خبر سنائی کہ وہ ایچ آئی وی پوزیٹیو ہے۔ اس کو ایسا لگا جیسے ہسپتال کی چھت اس کے اوپر گرنے والی ہے۔ کئی روز اس کا علاج ہوتا رہا۔ بخار جب پوری طرح اتر گیا تو ڈاکٹر نے چند دوائیاں لکھ کر دیں اور ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا۔

سیموئل کی آنکھوں میں دنیا تاریک نظر آنے لگی۔ اس نے پہلی فرصت میں اپنے شہر کی گاڑی پکڑ لی۔ آہستہ آہستہ وہاں بھی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ ایچ آئی وی پوزیٹیو ہے، اس لیے سبھی نے اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا جیسے کسی متعدّی بیماری میں مبتلا ہو۔ بیوی بچے تو تھے ہی نہیں کیونکہ ان کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی۔ یار دوست جو آگے پیچھے گھوما کرتے تھے کنی کاٹنے لگے۔ اس چھوٹے سے شہر میں وہ کچھ ہی روز اپنی جائیگاہ پر رہ پایا اور آخر کار اسے ہیچ کرائیڈس شیلٹر میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہوا۔

تب سے سیموئل اسی شیلٹر میں زندگی کے معینہ دن کاٹ رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ

زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گا کیونکہ اس مہلک بیماری سے آج تک کوئی نہیں بچ پایا۔ البتہ گرجا گھر کے پادری نے کچھ روز پہلے یہ کہہ کر اس کی ڈھارس بندھائی کہ یسوعؑ ہم جیسے گناہ گاروں کو بچانے کے لیے ہی صلیب پر چڑھ گیا تھا۔

سیموئل اب زندگی کا نہیں بلکہ موت کا طلبگار ہے۔ وہ صبح وشام انجیل مقدس یہ سوچ کر پڑھتا ہے کہ شاید یسوعؑ کی قربانی اس کی موت کو آسان کر سکے اور وہ نارِ دوزخ کی تپش سے بچ جائے۔

وہ بہت کم سو پاتا ہے۔ دن رات صرف سوچتا رہتا ہے۔ ماضی کے ہر لمحے کو یاد کرتا ہے۔ یادوں کے اسی سلسلے میں آج اس کو اپنی شروعاتی ملازمت کا خیال آیا۔ سیموئل کو اس پٹرول پمپ کی یاد آئی جہاں وہ عنفوان شباب میں کام کرتا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ ہاتھ میں چھڑی اٹھائی، صدر گیٹ کے باہر نکلا اور آٹو رکشا لے کر سید ھالنک روڈ پہنچ گیا۔

وقت کا چرخ پوری گردش کر کے پھر وہیں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆☆☆

الم آشنا دِل

والدین کو مٹی دینے کے تُرت بعد بیٹوں میں تناتنی بڑھ گئی۔ سارا گھر تاش کے پتوں کی طرح بکھر گیا۔ خدا کا شکر تھا کہ بیٹی پہلے ہی بیاہی جا چکی تھی ورنہ اس کو بھی مارے مارے پھرنا پڑتا۔ جب تک ماں باپ زندہ تھے گھر میں ایک ہی چولہا جلتا تھا اور سب کماؤ بیٹے ہر ماہ اپنی تنخواہیں ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ ماں کے چہرے پر نہ اس وقت کوئی پریشانی دکھائی دی جب صرف اس کا شوہر کماتا تھا اور سات لوگ کھاتے تھے اور نہ ہی بعد میں کوئی شادمانی نظر آنے لگی جب گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہونے لگی۔ البتہ یہ خوشیاں چندروزہ ثابت ہوئیں۔ کار حادثے میں میاں بیوی دونوں زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔

جمعہ تک مصلحتاً سب خاموش رہے۔ اس کے بعد گھر میں پنچایت بٹھائی گئی۔ بحث کی شروعات سب سے بڑے بیٹے ڈاکٹر الیاس وانی نے کی جو یونیورسٹی میں ریڈر تھا۔ اس کی آمدنی معقول تھی مگر جیسا کہ عام طور پر اساتذہ کے خمیر میں ہوتا ہے، میاں بیوی دونوں کنجوس مکھی چوس تھے۔ خدا نے بھی اپنی عنایتوں سے ہاتھ روک لیا تھا اور خواہش کے باوجود انھیں بیٹے سے محروم رکھا۔ ڈاکٹر وانی متانت سے بول اٹھا۔

''بھائیو، آج کل ہر کوئی الگ رہنا چاہتا ہے۔ اپنے ہی بکھیڑوں سے فرصت نہیں ملتی پھر دوسروں کے پھٹے میں کون پاؤں دینا پسند کرے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ہم موروثی جائیداد کا بٹوارا کر لیں۔''

سبھی بھائیوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ دوسرا بیٹا شوکت وانی ، جو پبلک ورکس

ڈیپارٹمنٹ میں انجینئر تھا، کب سے اسی موقعے کی تلاش میں تھا۔اس کی دلی خواہش تھی کہ جو بالائی آمدنی اس نے دوسروں سے چوری چھپے اکٹھا کی تھی اس سے ایک خوبصورت آرام دہ بنگلہ بنا لے جس میں سردیوں کے دوران کمروں کو حمام سے گرم کرنے کی سہولت میسر ہو۔اس نے اپنی تجویز پیش کی۔

''بھائیو والدین یہ دس کمروں والا مکان، تیس ہزار کے معیادی ڈیپازٹ اور کچھ زیورات چھوڑ گئے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ بہن کو زیورات اور ڈیپازٹوں سے ملنے والی رقم دی جائے، شادی شدہ بھائیوں میں تین تین کمرے بانٹ دیے جائیں اور اصغر کے لیے ایک کمرہ مختص کیا جائے۔''

''اصغر کو ایک ہی کمرہ کیوں؟'' تیسرا بھائی جاوید وانی چھوٹے بھائی کی حمایت میں بول اٹھا۔جاوید نے کشاں کشاں میٹرک پاس کر کے کالج جانے سے انکار کیا تھا۔باپ نے ایک لاکھ کی پگڑی دے کر دُکان خرید کر دی تھی جہاں وہ لیڈیز گارمینٹس اور ہوزری بیچ کر دن بھر مست رہتا۔ بیوی اور دو بچوں کا خرچہ آسانی سے نکلتا تھا۔

''اصغر ابھی کچھ بھی نہیں کرتا ہے۔اس کی تعلیم، کھانے پینے، کپڑے لتے اور دوا دارو کا خرچہ ہمیں اٹھانا پڑے گا۔کیا معلوم کتنے سال لگ جائیں گے۔'' شوکت وانی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

اصغر وانی چُپ چاپ سنتا رہا۔اس نے خاموش رہنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھی ورنہ گھر کا رہتا نہ گھاٹ کا۔اصغر نے دو مہینے قبل کالج میں داخلہ لیا تھا اور ابھی گریجویشن مکمل کرنے میں تین سال باقی تھے۔ملازمت ملنے میں مزید کتنے سال لگ جاتے اسے معلوم نہ تھا۔اُدھر پروین بھی تھی جو اس کا کب سے انتظار کر رہی تھی۔وہ پڑوس میں رہتی تھی اور اصغر کے والدین کا دل جیتنے میں کامیاب ہو چکی تھی مگر والدین تو اب اس دنیا میں نہیں رہے اس لیے وہ اس کے گھر میں قدم رکھنے

سے بھی ڈرتی تھی۔ کبھی کبھار سکول جاتے وقت اصغر سے ملاقات ہو جاتی تو حال چال پوچھ لیتی۔ کچھ دنوں سے وہ بھی کھنچی کھنچی سی نظر آ رہی تھی۔

اِدھر بحث صرف مکان کے بٹوارے پر نہیں تھمی بلکہ اصغر پر کون کتنا خرچ کرے گا یہ بھی زیر بحث آیا۔ اس بارے میں ڈاکٹر الیاس نے پہل کی۔

"جہاں تک اصغر کے اخراجات کا سوال ہے، ہمیں اس کا ذاتی خرچ اٹھانا پڑے گا۔ کم سے کم جب تک وہ گریجویشن مکمل کر کے کہیں ملازمت نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب اس کا خرچہ باری باری اٹھالیں گے۔ ایک سال وہ ایک بھائی کے ساتھ رہے گا، دوسرے سال دوسرے بھائی کے ساتھ اور تیسرے سال تیسرے بھائی کے ساتھ۔ یہ دائرہ تب تک یوں ہی چلتا رہے گا جب تک اصغر خود کفیل نہیں ہوتا۔"

بات معقول تھی۔ اس پر بھی سبھی لوگ راضی ہو گئے لیکن اصغر کے دل میں آتش فشاں کروٹیں لینے لگا۔ اس کے باوجود منہ پر تالے لگے رہے۔ چپ چاپ کمرے میں جا کر خود کو قید کر لیا اور سوچتا رہا کہ زندگی نے اس کو اتنا محتاج کیوں کر لیا؟ اس روز کے بعد وہ صرف اپنی پڑھائی پر مرتکز ہو گیا۔ اس کو اپنے حال پر گھن آنے لگی۔ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا بیٹا اور اتنا بے بس و لاچار! اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھکاریوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے اور ہر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا ہے۔

اتنا ہی نہیں، ابھی تو عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ کچھ عرصے کے بعد پروین نے خبر سنائی کہ دو چار روز میں اس کی سگائی ایک ڈاکٹر سے ہونے والی ہے اور اگلے مہینے شادی ہو رہی ہے۔ پروین نے اپنے والدین کو منانے کی بہت کوشش کی تھی مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے بھائیوں نے اصغر کو کہیں کا نہ چھوڑا، اس کا سارا حصہ ہڑپ لیا، اس لیے اب اس کے ساتھ شادی کرنا کنویں میں کودنے کے مترادف ہوگا۔ حالانکہ پروین نے یہاں تک کہہ دیا کہ اسے اصغر کے سوا اور

کچھ بھی نہیں چاہیے اور وہ دونوں مل جُل کر زندگی بسر کر سکتے ہیں مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ پروین کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ اصغر کے زخموں کا مداوا نہ بن سکے۔ اصغر کو لگ رہا تھا کہ نہ صرف اس کے رشتے ناتے بلکہ قدرت بھی اس کے خلاف سازش کر رہی ہے۔ بے یار و مدد گار وہ اپنی بے عزتی برداشت کرتا رہا اور اپنے احساسِ توہین کو اندر ہی اندر دباتا رہا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ جوں توں کر کے اس نے بی اے پاس کر لیا اور مزید پڑھائی ترک کر لی۔ اپنے ایک دوست عمران کے مشورے پر وہ کشمیری شال اور ایمبرائیڈری کا سامان بیچنے کے لیے اس کے ہمراہ پھیری پھرنے کے لیے دہلی چلا گیا۔

بھائیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا کہ چلو مصیبت ٹل گئی۔ شوکت وانی نے اپنا حصہ بڑے بھائی کو بیچ کر خود ایک خوبصورت بنگلہ بنوا لیا۔ انجینئر تو تھا ہی اس پر طرّہ یہ کہ جمع کی ہوئی پونجی بھی کام آ گئی۔ بہن کو اپنا حصہ کیا ملا اس نے مڑ کر پھر کبھی نہ دیکھا۔

دہلی میں اصغر کو دو چار روز ٹھہرنا پڑا۔ ایک روز وہ یوں ہی آندھرا بھون کے پاس گھوم رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے ہجوم پر پڑی۔ وہاں دو سیاسی گرہوں کا آپس میں سر پھٹول ہو رہا تھا۔ ایک آدمی فٹ پاتھ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں گھائل پڑا تھا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اصغر سے رہا نہ گیا، جا کر بسلیری کی ایک بوتل خرید لی، اسے پانی پلا دیا اور اس کی پھٹی ہوئی قمیص کا نچلا حصہ کاٹ کر اس کے زخم پر پٹّی باندھ لی۔ پھر آٹو رکشا میں بٹھا کر پہلے پولیس سٹیشن میں رپورٹ درج کروائی اور اس کے بعد ہسپتال لے گیا جہاں اس کی مرہم پٹّی کی گئی۔ ہسپتال سے چھٹی ملتے ہی اصغر اس کو واپس آندھرا بھون لے آیا۔ تب تک مریض کے ہوش و حواس بحال ہو چکے تھے اور بھون کا ماحول بھی سدھر چکا تھا۔ وہ اصغر کو لے کر سیدھا ڈائننگ ہال میں چلا گیا اور کافی کا آرڈر دے دیا۔

''بھائی، میرا نام سلیم انصاری ہے۔ میں حال ہی میں آندھرا پردیش سے پارلیمانی

انتخابات میں منتخب ہو چکا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ تم نے تو آج میری جان بچائی۔ ویسے بھی میں دل کا مریض ہوں۔ بے موت مارا جاتا۔''

اصغر یہ سن کر حیران ہو گیا۔ اسے یقین نہیں ہوا کہ ایسے ذی عزت لوگ بھی کتوں کی طرح لڑتے ہیں۔ جواباً بولا۔ ''اس میں تشکر کی کیا بات ہے بھائی صاحب۔ بحیثیت انسان یہ تو میرا فرض بنتا تھا سو میں نے نبھایا۔''

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

''میرا نام اصغر وانی ہے۔ سرینگر سے آیا ہوں۔ شال اور ایمبر ایڈری کا سامان بیچنے کے واسطے۔''

''کچھ پڑھے لکھے ہو یا نہیں؟''

''فرسٹ ڈویژن میں گریجویشن پاس کیا ہے مگر گھریلو حالات کے سبب آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔''

سلیم انصاری کو اس کے بارے میں مزید جاننے کی چاہت ہوئی اس لیے اصغر نے اختصار سے اپنا سارا ماجرا سنایا۔ سلیم انصاری بہت متاثر ہوا۔ کہنے لگا۔ ''بھائی، آجکل یہاں سیاسی اتھل پتھل ہو رہی ہے۔ کئی لوگ برسر اقتدار پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں اور مجھے بھی دَل بدلنے کے لیے اصرار کر رہے ہیں مگر میں اس کو بے ایمانی سمجھتا ہوں۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس لیے انھوں نے میرے ساتھ بدسلوکی کی۔ خدا کی اگر مہربانی رہی اور ہماری پارٹی نے اکثریت ثابت کر لی تو دیکھ لینا ہمارے دن پھر جائیں گے۔ رہی مار پیٹ کی بات وہ تو پبلک لائف میں ہوتی رہتی ہے۔''

''بھائی صاحب، میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ ایسی بھی کیا مجبوری ہے کہ آدمی کرسی کے لیے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے کہ آپ کی حالت کتنی نازک

تھی۔ چوٹ ذرا اور گہری ہوتی یا خون زیادہ بہہ جاتا تو آپ اس وقت میرے ساتھ باتیں نہیں کر رہے ہوتے۔''

''بھائی یہ تو سیاست کی مجبوریاں ہیں۔ ایسے حادثات کے لیے ہمیں تیار رہنا پڑتا ہے۔''

''خیر جیسے آپ مناسب سمجھتے ہیں، اب مجھے اجازت دیجیے۔'' اصغر نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''ٹھیک ہے مگر ایک بات یاد رکھنا۔ میں کل حیدر آباد جا رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد لوٹ آؤں گا۔ تم ایک ہفتے بعد مجھ سے ضرور ملنا۔ دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔'' اتنا کہہ کر سلیم انصاری نے گرم جوشی سے نہ صرف مصافحہ کیا بلکہ اصغر کو گلے بھی لگایا۔

آندھرا بھون سے نکلتے ہی اصغر وانی کی امیدوں کے پر لگ گئے۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمایا مگر دوسرے ہی لمحے اس کو یاد آیا کہ سلیم انصاری سیاست دان ہے اور لوگوں کو ایسے خواب دکھانا سیاست دانوں کی فطرت ہے۔ پھولا ہوا غبارہ یکا یک پھسک گیا اور اصغر بوجھل قدموں سے اپنی رہائش پر لوٹ آیا۔

ہفتہ بھر میں کایا پلٹ گئی۔ اِدھر اصغر اپنے دوست کے ساتھ پھیری کرنے کے لیے کولکتہ پہنچ گیا اُدھر سلیم انصاری مرکزی کابینہ میں ڈپٹی منسٹر بن گیا۔ نا اُمیدی کے باوجود کولکتہ کے قیام کے دوران اصغر کی چھٹی حِس اسے دہلی واپس لوٹنے کے لیے اُکساتی رہی۔ آخر کار اس نے نویں روز آندھرا بھون میں حاضری دی۔ اتوار کا دن تھا۔ ریسیپشن سے پتا چلا کہ سلیم انصاری محکمۂ صحت و خاندانی بہبود میں ڈپٹی منسٹر بن چکا ہے اور اب اشوکا روڈ پر ۱۵ نمبر بنگلے میں رہتا ہے۔ اصغر کے دل میں عجیب سی جھجک پیدا ہو گئی۔ سوچنے لگا۔ ''سیاست دان تو تاچشم ہوتا ہے۔ اِدھر کرسی ملی نہیں اُدھر ساتویں آسمان پر دماغ اُڑنے لگتا ہے۔ نہ جانے پہچانے گا بھی یا نہیں؟''

''پھر بھی کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے۔'' اندر سے آواز آئی۔ وہ فوراً سلیم انصاری سے

ملنے چلا گیا۔اس کی حیرانی کی اس وقت حد نہ رہی جب اس نے سلیم انصاری کو اپنا منتظر پایا۔

''آؤ بھئی آؤ، کہاں رہے اتنے دن؟ بہت انتظار کروایا تم نے۔تم کو میں نے کہا تھا کہ مجھے ہفتہ بھر میں مل لینا۔''

''سر میں پھیری کرنے کے لیے کولکتہ چلا گیا تھا۔سوچا جب تک آپ واپس آئیں گے تب تک کچھ کمائی ہی کرلوں۔آج صبح ہی لوٹ آیا ہوں۔'' اصغر کے لہجے میں وہ پرانی سی بے تکلفی اب نظر نہیں آرہی تھی۔

''چلو جو ہوا سو ہوا۔تم نے سنا ہی ہوگا کہ میں ڈپٹی منسٹر بن چکا ہوں۔''

''ہاں سر، میری جانب سے مبارک باد قبول کر لیجیے۔''

''بھائی مبارک کے حقدار تو تم ہو۔اس دن میری جان نہ بچائی ہوتی تو آج میں اس کرسی پر کہاں بیٹھ جاتا۔خیر آل از ویل دیٹ اینڈس ویل۔''

''سر آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔میں کون ہوتا ہوں کسی کی جان بچانے والا۔یہ سب اللہ کو کرنا تھا، مجھے آلۂ کار بنالیا۔''

''خیر اب کام کی بات سنو۔مجھے تم سے اچھا اور مخلص دوست نہیں مل سکتا ہے۔میں تم کو اپنا پرائیویٹ اسسٹنٹ بنا رہا ہوں۔تمھارا کام میرے ذاتی کام کا انصرام، نجی خط و کتابت اور اپائنٹ منٹس فکس کرنا ہوگا۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔اصغر وانی جامے میں پھولا نہ سمایا مگر چہرے پر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رہا۔کہنے لگا۔''سر، میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔آپ جیسے کہیں گے میں کام کرنے کو تیار ہوں۔''

دوسرے روز صبح سویرے اصغر آفس پہنچا اور پی اے کا چارج لیا۔منسٹر صاحب کے پرائیویٹ سیکریٹری نے اسے جستہ جستہ رہنمائی کی حالانکہ کام سیکھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

سلیم انصاری نے اصغر کو نہ صرف اپنے مکان میں رہنے کی جگہ دی بلکہ اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی اپنے ساتھ ہی کروالیا۔ بدلے میں اصغر نے گھر کے انتظام کا بیڑا خوش اسلوبی سے اٹھالیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دونوں بچپن ہی سے ایک ساتھ پلے بڑھے ہوں۔

اصغر کی دنیا تیزی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ اس نے اِندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سے دو سال میں ایم بی اے مکمل کرلیا۔ اُدھر اس کے رشتے دار اس تاک میں بیٹھے رہے کہ کوئی ایسا موقع مل جائے کہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرسکیں۔ چٹھیوں پر چٹھیاں آتی رہیں۔ بھابیوں نے اپنی قریبی رشتے کی لڑکیوں کی بات چلانے کی کوششیں کیں مگر اصغر نے کسی کو گھاس بھی نہ ڈالی۔ اسے وہ دن بھلانا مشکل ہورہا تھا جب والدین کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ بھائیوں میں گھمسان چھڑ گیا تھا۔ پُشتینی مکان میں دیواریں اٹھ گئیں تھیں۔ بھاوجیں تو پرایا خون تھیں، ان کا رویہ تو سمجھ میں آتا تھا، مگر اپنے بھائیوں نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں۔ نان ونفقہ کے بہانے اس کی حق تلفی کی گئی تھی۔ ایک بہن تھی لیکن اس نے بھی مڑ کر کبھی نہ پوچھا کہ بھائی تم زندہ ہو یا مر گئے۔

اس کے برعکس خدا نے سلیم انصاری کی شکل میں ایک فرشتہ بھیج دیا۔ اس نے ماں باپ دونوں کے فرائض انجام دیے۔ وہ اصغر کی بھلائی برائی سوچتا رہا۔ اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں اچھے عہدے پر اس کی مستقل تقرری کرادی۔ اس کی شادی بھی دہلی کے ایک رئیس خاندان میں طے کرلی۔ لڑکی کالج میں لیکچرر تھی۔ شادی میں سرینگر سے صرف اصغر کا دوست عمران شریک ہوا۔

وقت کے جیسے پر لگ گئے۔ ایک روز عمران نے موبائیل پر اصغر کو بتایا کہ اس کا بڑا بھائی پروفیسر الیاس وانی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگیا ہے اور مقامی ڈاکٹروں نے اسے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ دہلی میں معائنہ کرانے کی صلاح دی ہے کیونکہ پرائیویٹ طور پر آپریشن کرانے کے لیے کم سے کم دس لاکھ کا خرچہ آسکتا ہے۔ بے چارے معلم کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی۔ اس پر چار لڑکیاں شادی کے لیے تیار بیٹھی ہیں۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ میں اس کو ایک

مہینے کے بعد اپوئنٹ منٹ دی گئی کیونکہ وہاں ایسے مریضوں کی پہلے ہی سے لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ تو بے چارہ درد سے بے حال ہو رہا ہے۔ کسی نے اسے بتایا کہ منسٹر وغیرہ کی سفارش ہو تو جلدی کام بن سکتا ہے۔ گھر میں سبھی لوگوں نے سمجھایا کہ اصغر سے بات کر کے دیکھ لو۔ بیوی کہتی رہی کہ اپنی غرض پر لوگ گدھے کو بھی باپ بناتے ہیں، وہ تو تمھارا سگا بھائی ہے۔ کوشش تو کرلو، نا تھوڑے ہی کرے گا۔ مگر پروفیسر الیاس کسی کی نہیں سنتا۔ کہتا ہے اصغر کے ساتھ تو میں نے اتنا ظلم کیا ہے پھر کونسا منہ لے کر اس کے پاس جاؤں گا۔

اصغر رات بھر جاگتا رہا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آج اس کا اپنا خون مدد کے لیے پکار رہا تھا پھر وہ اتنا سنگدل کیسے بن سکتا تھا۔ مانا کہ بھائیوں نے اس کے ساتھ وشواس گھات کیا تھا مگر ایسے موقعوں پر کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوتی ہے۔ دوسرے روز منسٹر صاحب کا خط لے کر وہ خود ہی انسٹی ٹیوٹ کے متعلقہ سپیشلسٹ ڈاکٹروں سے ملا اور اسی دن بڑے بھائی کو بذریعہ ہوائی جہاز دہلی لے آیا۔ کئی دنوں تک ٹیسٹ وغیرہ ہوتے رہے اور آخر کار ایک ہفتے کے بعد مریض کے پیٹ سے ٹیومر نکالا گیا۔ دریں اثنا اس کے بال بچے بھی آچکے تھے اور اصغر کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ گھنٹوں بعد جب پروفیسر الیاس کو ہوش آیا اس کی آنکھیں ندامت اور احسان کے ملے جلے جذبات سے نم تھیں۔ اس نے ایک نظر اپنی بیٹیوں پر ڈالی جن کے مستقبل کا تحفظ اصغر کی مہربانیوں کے سبب ممکن ہوا اور دوسری نظر اپنے بھائی اصغر پر دوڑائی جس کا مستقبل خود اس نے چھیننے کی کوشش کی تھی۔

ہمت بٹور کے پروفیسر الیاس نے اصغر کو اپنے پاس بُلا لیا اور لرزتی آواز میں کہنے لگا۔

''اصغر، سچ تو یہ ہے کہ تمھارا مجرم میں ہوں کیونکہ میں گھر میں سب سے بڑا تھا۔ میں تو معافی کے لائق بھی نہیں ہوں۔ پھر بھی اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

☆☆☆☆☆

پراویڈنٹ فنڈ

تری پورا میں پوسٹنگ کے دوران میں نے جنرل پراویڈنٹ فنڈ سے نکاسی کی شرائط پر سختی سے عمل کرنے کا آرڈر جاری کیا۔ مجھے یہ خبر ملی تھی کہ ملازمین طرح طرح کے بہانے بنا کر جی پی فنڈ سے بار بار روپے نکالتے ہیں اور اپنے کنبوں کو فراموش کر کے شراب اور جوئے پر خرچ کرتے ہیں۔ اگرتلا میں ڈائریکٹر پوسٹل سروسز کا چارج سنبھالے ہوئے مجھے کچھ ہی مہینے ہوئے تھے اور وہاں کے باشندوں کی خستہ حالت دیکھ کر بہت مایوسی ہو چکی تھی۔ مغربی بنگال اور کیرالا کے علاوہ تری پورا ہی ایک ایسی ریاست تھی جہاں آزادی کے بعد کمیونسٹوں کا ہمیشہ دبدبہ رہا۔

دورانِ تعلیم میں بھی سوشلسٹ نظریے سے جذباتی طور پر منسلک رہا۔ دیگر ترقی پسندوں کی طرح میرا بھی یہ خیال تھا کہ اشتراکیت غربت اور غربت سے وابستہ سبھی ناسوروں سے نجات دلا سکتی ہے۔ لیکن جب ذہن بالغ ہوا اور کمیونسٹ بلاک سے آہنی پردہ ہٹ گیا تو تلخ سچائی میرے سامنے آگئی۔ تاہم اس نظریے نے میرے اندر جو غریب نوازی کا بیج بویا تھا وہ کبھی ناس نہ ہو سکا۔ میں افسر شاہی کا رکن تو بن گیا لیکن غریبوں کی حمایت کرنا اور ان کی مصیبتوں کا ازالہ کرنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھتا رہا حالانکہ یہ بات میرے رفیق کاروں کو کبھی راس نہ آئی۔

تری پورا میں اروناچل پردیش، میگھالیہ اور ناگالینڈ کی طرح مناظر قدرت کی فراوانی نہیں ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر میدانی ہے۔ نہ کہیں اونچے اونچے برفانی پہاڑ ملتے ہیں اور نہ ہی گھنے جنگل۔ میگھالیہ کی طرح یہاں کوئلے کی کانیں بھی نہیں ملتیں۔ اس مٹی میں کٹھل، لیچی اور اناناس وافر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں اور ٹرکوں میں بھر بھر کر بنگلہ دیش تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں

نے کئی بار کٹھل بطور سبزی کھائی تھی مگر یہاں آ کر پہلی بار معلوم ہوا کہ یہ پھل پک کر آم کی مانند لذیذ اور خوشبودار بن جاتا ہے۔ تریپورا پسماندہ ریاست ہے اور یہاں کے باشندے لکیر کے فقیر ہیں۔ آزادی حاصل کیے پچاس سے بھی زیادہ برس گزر گئے تھے پھر بھی نہ کہیں صنعتی ترقی نظر آ رہی تھی اور نہ ہی پیشہ ورانہ تعلیمی ادارے۔ اچھی تعلیم یا روزگار حاصل کرنے کے لیے نوجوانوں کو کولکتہ جیسے شہروں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ بچے کھچے لوگ جو یہاں رہتے ہیں وہ اپنی زندگی کی نیا قسمت کے حوالے کر کے خود تفنّنِ طبع کے لیے شراب، جُوے اور منشیات کا سہارا لیتے ہیں۔ شمال مشرقی ہندستان میں شراب، منشیات اور جوے خاص کر مٹکے کا چلن بیشتر ریاستوں میں مقبول خاص و عام ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مشرقی پاکستان سے آئے مہاجر، جو زیادہ تر بنگالی تھے، یہاں آ کر بس گئے اور شریف النفس وشہری مکاریوں اور جعلسازیوں سے ناآشنا تریپوری قبائلوں پر حاوی ہو گئے۔ انجام کار تریپوری قبائل سمٹ کر اقلیت میں تبدیل ہو گئے اور اپنی حق تلفی ہوتے دیکھ کر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ ریاست میں دہشت گردی کا دور دورہ شروع ہوا اور تھمنے کا نام بھی نہ لیا۔ اس صورت حال کا فائدہ اٹھا کر مارکسی کمیونسٹ غریب عوام کو پر فریب سپنے دکھاتے رہے اور ان کا استحصال کرتے رہے۔ ان ہی کمیونسٹ حکومتوں کی چھتر چھایا میں ٹریڈ یونینیں بھی پنپتی رہی ہیں۔

میرے فیصلے پر بھی ٹریڈ یونینوں کے رہنما خفا ہو گئے۔ جیئنت مجمدار اور اس کے چند ساتھی، جو مارکسی یونین سے وابستہ تھے، میرے دفتر میں آ کر احتجاج کرنے لگے حالانکہ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ میرا فیصلہ غریبوں کے مفاد کے لیے ہے۔ جی پی فنڈ سے رقم کی نکاسی کے لیے حکومت نے کچھ شرطیں لگا رکھی ہیں جیسے ضرورت کی وجہ سے آگاہ کرنا، اس کا خاطر خواہ ثبوت فراہم کرنا، پیش کی گئی وجہ کی پڑتال کرنا وغیرہ۔ چنانچہ فنڈ میں ملازم کی اپنی جمع کی ہوئی رقم ہوتی ہے اس لیے عام طور پر افسر درخواست میں لکھی ہوئی وجہ کی تصدیق کروانے پر زور نہیں دیتے اور نہ ہی ملازم سے اس کا ثبوت مانگتے ہیں۔ ایک صحت مند معاشرے میں یہ ترکیب کام کر سکتی ہے

مگر جہاں غریب ملازمین بری عادتوں کے نرغے میں پھنس گئے ہوں اور اپنا برا بھلا سوچنے سے قاصر ہوں، وہاں افسروں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس وبا سے اپنے ماتحتوں کو بچائیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے گورنمنٹ احکامات کو سختی سے لاگو کرنے کا حکم دیا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ٹریڈ یونینیں اپنے رفیقِ کاروں کی بہبود کے لیے میرے اس قدم کو سراہیں گی۔ مگر میرا یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا۔

ٹریڈ یونین لیڈر کے ساتھ اس بات پر دیر تک مناظرہ ہوا۔ وہ بہ آواز بلند کہنے لگا۔

''سر آپ نے یہ کیسا نادر شاہی فرمان صادر کیا ہے؟ سنا ہے آپ نے جی پی ایف سے روپے نکالنے پر روک لگا دی ہے۔ یہ تو غریب ملازموں پر سراسر ظلم ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ ان کی اپنی خون پسینے کی کمائی ہے جو گورنمنٹ کے پاس امانت رہتی ہے، پھر آپ کون ہوتے ہیں اس فنڈ سے نکاسی پر روک لگانے والے؟''

''آپ شانت ہو جایئے۔ میں نے کوئی نیا قانون نہیں بنایا ہے۔ میں نے صرف گورنمنٹ کے احکامات کی پابندی سے تعمیل کرنے کو کہا ہے۔ لوگ آج تک بہانے بنا کر فنڈ سے رقم نکالتے رہے ہیں جو جائز نہیں ہے۔ مکان کی دس بار چھت پڑتی ہے۔ لڑکے کا پانچ چھ بار مُنڈن ہوتا ہے۔ لڑکی کی دو تین بار شادی ہو جاتی ہے۔ جھوٹے وجوہات لکھ کر رقوم کی نکاسی ہوتی ہے اور ساری رقم یا تو جوے کی نذر ہو جاتی ہے یا پھر شراب کی۔ نتیجتاً اکثر ملازموں کے جی پی ایف بیلنس کم سے کم سطح پر آ چکے ہیں۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ درخواست میں جو وجہ دی جاتی ہے اس کی جانچ پڑتال کر کے ہی رقم ادا کی جائے۔ آخر وہ بھی تو ہمارے بھائی بندو ہیں۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ اور ان کے کنبے خوشحال رہیں؟''

گفتگو کے دوران میری یہ کوشش رہی کہ اپنے فیصلے کے ہر پہلو کو مجمدار کے سامنے رکھ دوں۔ آخر کار میں نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے اپنی سوچ و فکر پر نظر ثانی کرنے کی التماس کی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ حقیقت سے بے خبر تھا مگر وہ اپنی یونین کے ممبروں کی خفگی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس

لیے کہنے لگا۔

"سر، آپ کو کیا لگتا ہے کہ مجھے یہ سب کچھ معلوم نہیں ہے۔ دراصل بات یوں ہے کہ اگر میں اس مسئلے کو ایڈمنسٹریشن کے سامنے نہ اٹھاؤں تو دوسری یونین اٹھائے گی اور ہوسکتا ہے بہت سارے ملازم ہماری یونین چھوڑ کر ان کے ساتھ ہولیں۔ ملازموں کو وہی یونین اچھی لگتی ہے جو زور وشور سے ان کے جائز وناجائز مسئلوں کی طرف انتظامیہ کی توجہ مبذول کرے۔ سر، یہ میری مجبوری ہے اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس آرڈر کو واپس لے لیں۔"

جیئنت مجمدار کے اس دوٹوک جواب سے میں متاثر ہوا۔ یونینوں کا کیا، وہ اس وجودی کشاکش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خاطر کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ انھیں رفاہِ رفقا سے زیادہ یونین کی ممبرشپ کی فکر لگی رہتی ہے۔ سو فیصلہ یہ ہوا کہ کچھ حد تک آرڈر میں ڈھیل دی جائے۔ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔

اس مناظرے میں ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ ایک پوسٹ ماسٹر کی موت اگرتلا کا صدر ہسپتال، جی بی ہاسپٹل، میں واقع ہوئی۔ خبر ملتے ہی میں تعزیت کے لیے فوراً وہاں پہنچ گیا۔ روایت کے مطابق اس کی تجہیز وتکفین کے لیے مجھے دفتر سے اپنے ساتھ طے شدہ رقم لے جانی چاہیے تھی مگر میں جلد بازی میں بھول گیا۔ ہسپتال میں کسی نے اس جانب اشارہ کیا لیکن تب تک دیر ہوچکی تھی۔ سوچا جب تک لاش گھر پہنچادی جائے گی تب تک میں کسی کے ہاتھ روپے بھجوادوں گا۔ اسی دوران میں یونین سیکریٹری جیئنت مجمدار بھی پہنچ گیا۔

پوسٹ ماسٹر کی لاش ہسپتال کے جنرل وارڈ میں بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ کچھ وقفے کے بعد میں نے مجمدار سے کہا۔

"سٹریچر منگوا لیجیے۔ لاش کو نیچے لے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ٹیکسی کا بھی انتظام کروا لیجیے تاکہ اس کو گھر تک پہنچایا جائے۔"

''سر، یہاں ٹیکسی نہیں ملتی۔تھری وھیلر مل جائے گا۔اسی میں لے جائیں گے۔''اس نے جواب دیا اور کسی کو اشارے سے تھری وھیلر لانے کو کہہ دیا۔

دریں اثنا دو آدمیوں نے سٹریچر لاکر ہمارے سامنے رکھ دیا۔سٹریچر دیکھ کر مجمدار مجھ سے مخاطب ہوا۔

''سر، میں ابھی کسی سوئیپر کو بلواتا ہوں۔وہ لاش اٹھا کر نیچے لے جائے گا۔''

''کیوں ہم نہیں لے جاسکتے؟ سوئیپر کی کیا ضرورت ہے۔''

''نہیں سر یہاں کا رواج ہی ایسا ہے۔مردے کو اٹھانے میں سبھی سنکوچ کرتے ہیں۔''

یہ سن کر میرا دل کھٹا ہو گیا۔مجمدار کے چہرے کو گھورتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ لاش کو کوئی بھی آدمی ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھا۔رسماً یہ کام مہتر کا ہے۔وہ لوگ جو کل تک اس آدمی کے رفقائے کار تھے،اس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے،آج اس کے مردہ جسم کو ہاتھ لگانے سے کترا رہے تھے۔ہندوستان میں آدمی چاہے کتنا ہی کٹر کمیونسٹ کیوں نہ ہو،طبقاتی امتیاز نسلاً بعد نسلٍ اس کو ورثے میں مل ہی جاتا ہے۔میں نے ہمت کر کے اپنے بازو میت کے نیچے گھسا دیے اور نعش کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر سٹریچر پر رکھ دیا۔وہاں موجود سبھی ملازم حیراں ہو گئے اور مارے شرم کے جلدی سے سٹریچر پر لاش کو ٹھیک طرح سے رکھنے لگے۔پھر اسے اٹھا کر نیچے صدر گیٹ تک لے گئے جہاں ایک آٹو رکشا انتظار کر رہا تھا۔انھوں نے لاش کو اٹھا کر سلیقے سے آٹو رکشا میں رکھ دیا اور پھر اس کی بغل میں ایک جلتا ہوا دیا رکھ دیا۔

پوسٹ ماسٹر کی بیوی آٹو کے پاس کھڑی زاروقطار رو رہی تھی۔وہ آٹو رکشا کے اندر نہیں گھس رہی تھی بلکہ باہر کھڑی مجھے اور مجمدار کو باری باری توقع بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اسے دلاسہ دینا مناسب سمجھا۔

''بہن،تم آٹو میں لاش کے ساتھ چلی جاؤ،باقی لوگ بھی وہیں پہنچ جائیں گے۔گھبرانے

کی کوئی بات نہیں ہے۔''

اس نے سنی ان سنی کر دی اور مجھے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ اتنی دیر میں ایک اور ملازم نے، جو ہمارے ساتھ ہی کھڑا تھا، اسے بنگالی میں کچھ کہا اور جواب ملتے ہی مجھ سے مخاطب ہوا۔

''سر اس بے چاری کی جیب میں ایک ٹکا بھی نہیں ہے وہ کیسے گھر جائے گی؟ آٹو رکشا کا بھاڑا کہاں سے لائے گی؟ اس کا پتی تو اوّل نمبر کا جواری اور شرابی تھا۔ شراب کی وجہ ہی سے اس کا جگر سڑ چکا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کماتا تھا خرابات کی نذر کر دیتا۔ اگر اس کے پراویڈنٹ فنڈ کا بیلنس دیکھیں گے وہاں بس تھوڑی سی رقم بچی ہوئی ہے۔ نہ جانے بازار سے کتنا قرض اٹھایا ہوگا۔ شکر ہے کہ گورنمنٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ نہیں تو بچوں کے سر پر چھت بھی نہ ہوتی۔ سامنے کھڑی یہ بے چاری عورت تین بچوں کی ماں ہے۔ خود منڈی میں سبزی بیچ کر بچوں کو پالتی ہے۔ اور وہ تھا کہ پوری تنخواہ باہر باہر ہی اڑا دیتا، گھر میں دمڑی بھی خرچ نہیں کرتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ آئے دن بیوی سے ہی پیسے مانگتا اور اگر وہ انکار کرتی تو زدوکوب کر کے اسے روتی بسورتی چھوڑ جاتا۔''

اس کی باتیں سن کر میں مغموم ہو گیا۔ اس سے قبل مجھے گماں بھی نہ تھا کہ انسان جب بُری عادتوں کا شکار ہو جاتا ہے وہ اپنے جسم، ضمیر اور روح، سبھی کو گروی رکھ لیتا ہے اور اس کا وجود ایک مستقل ناسور بن جاتا ہے۔ وہ اتنا سفّاک ہو جاتا ہے کہ اپنے بال بچوں کی بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔ حالانکہ میرے کانوں میں ان باتوں کی بھنک بہت پہلے پڑ چکی تھی جس وجہ سے میں نے جی پی فنڈ سے نکاسی پر کسی حد تک روک لگانے کی کوشش کی تھی مگر یہ مرض اس نوعیت کا ہوگا یہ مجھے آج ہی پتا چلا۔

میں نے اپنی جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اس غمزدہ عورت کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر اسے مخاطب ہوا۔

''بہن، یہ رکھ لو اور آٹو والے کو دے دینا۔ میں ابھی آفس جا کر پوری رقم کا بندوبست کر

لیتاہوں اور گھنٹے بھر میں آپ کے گھر بھجوادوں گا۔''

جیئنت مجمدار بھی یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری آنکھوں سے آنکھیں ملانے میں ہچکچا رہا ہے۔ یوں تو وہ بہت باتونی ہے لیکن کچھ سمئے سے اس کے منہ پر قفل لگ چکا تھا۔ یا تو اس کا اپنا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا یا پھر وہ سوچ رہا تھا کہ آگے کون سا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ کون جانے اس کے من میں کیا ترنگیں اٹھ رہی تھیں۔

جہاں تک میرا سوال تھا میں فکر و تردّد کے اتھاہ سمندر میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ مجھے انسان کی سفلی فطرت سے نفرت ہو رہی تھی کہ اپنی خودغرضی کے لیے وہ دوسروں کو داؤں پر لگانے سے بھی نہیں کتراتا۔ اس کے لیے بال بچے، بھائی بند و اور رشتے ناتے سب زندگی طے کرنے کے ذینے بن جاتے ہیں تا کہ وہ خود زندگی کے مزے لوٹتا رہے۔

اسی فکر و تردّد کے عالم میں میں نے جمع ہوئے سوگواروں سے رخصت لی اور دفتر کی جانب چل پڑا۔ روپے کا بندوبست کر کے پھر اپنے گھر چلا گیا۔ رات بھر نیند پلکوں سے کوسوں دور بھاگتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس غریب بیوہ کی شبیہ بار بار ابھر رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ تین معصوم بچوں کے ساتھ پہاڑ جیسی زندگی کیسے بسر کرے گی۔ من میں ایک ہی سوال بار بار اُٹھ رہا تھا کہ ٹریڈ یونین کا وجود اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کی بہبود کے لیے ہے یا پھر ان کی بربادی کے لیے؟

☆☆☆☆☆

انٹرویو

وردی پوش آدمی نے میرا نام پکارا۔

ردّعمل میں میرے سیسے جیسے بھاری قدم لاشعوری طور پر انٹرویو ہال کی جانب اٹھنے لگے۔آج نہ جانے کیوں میرے ذہن کو بہت سارے اندیشوں نے خود بخود جکڑ لیا۔

ایسا نہیں تھا کہ مجھے پہلی بار انٹرویو بورڈ کا سامنا کرنا تھا۔گذشتہ سال ایمپلائمنٹ ایکسچینج نے اسی نوکری کے لیے میرا نام بھیجا تھا اور میں انٹرویو میں کامیاب بھی ہوا تھا مگر شومئی قسمت یہ کہ جہاں میں اس سے پہلے کام کر رہا تھا وہاں سے نوکری چھوڑنے کی اجازت وقت پر نہیں ملی۔انجام کار اتنی اچھی اور من موافق نوکری ہاتھ سے چلی گئی۔ان دنوں میری پوسٹنگ دلّی میں تھی مگر بعد میں میرا تبادلہ سرینگر ہو گیا۔

سانپ کا ڈسّا رسی سے بھی ڈرتا ہے۔امسال میں نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔چونکہ انٹرویو جون کے مہینے میں متوقع تھا اس لیے مئی ہی میں موجودہ نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اس کو دس بارہ روز میں منظور کروالیا۔

نوکری اپنی چاہت کے مطابق نہ ہو تو گھٹن سی ہوتی ہے۔اس روز مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے پیروں کی بیڑیاں کاٹ کر مجھے آزاد کر دیا ہو۔البتہ یہ آزادی بہت مہنگی ثابت ہوئی۔جب سے نوکری چھوٹ گئی ہر چہرہ اجنبی بنتا چلا گیا۔وہ لوگ جو مجھے انٹلکچول کہا کرتے تھے اب سیدھے منہ بات بھی نہ کرتے۔دوست جو میری تعریفوں کے پُل باندھتے تھے اور مجھ سے مشورے لیتے تھے اب اُلٹے نصیحتیں کرنے لگے۔ان کی نصیحتوں کا لُب لباب یہی ہوتا کہ مجھے پہلے

دوسری نوکری کا بندوبست کر لینا چاہیے تھا اس کے بعد ہی نوکری چھوڑنی چاہیے تھی۔ مجھے اپنی صلاحیت پر سے اعتماد اُٹھتا چلا گیا۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہو رہا تھا۔ دل ہی دل میں اس گھڑی کو کوستا رہا جس گھڑی میں نے اپنا استعفیٰ دائر کیا۔ ساتھ ہی اس رشتے دار کو بھی کوستا رہا جس کے جھانسے میں آ کر میں نے ایسا غیر متوقع قدم اُٹھایا۔

بات دراصل یوں تھی کہ گذشتہ برس میرا ایک رشتہ دار فوج چھوڑ کر دلّی میں نوکری ڈھونڈنے کے لیے آیا تھا اور تین مہینے میرے ساتھ رہ کر ڈی ڈی اے میں افسر بن بیٹھا۔ قلیل تنخواہ کے باوجود میں نے اس کو تین مہینے کیسے برداشت کیا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کچھ مدت بعد میرا تبادلہ سرینگر ہیڈ آفس ہوا۔ اپریل میں وہ سرینگر آیا اور مجھ سے میرے آفس میں ملا۔ وہاں میری مالی تنگ دستی اور ذہنی انتشار پر ترس کھا کر اس نے مجھے موجودہ نوکری چھوڑنے اور دلّی میں کوئی من موافق نوکری ڈھونڈنے کی صلاح دی۔ اس نے مجھے یہ بھی بھروسہ دلایا کہ جب تک مجھے نئی نوکری نہیں ملتی وہ مجھے کسی پرائیویٹ کنٹریکٹر کے پاس عارضی ملازمت دلوائے گا۔ سو میں اس کی باتوں میں آ گیا اور نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کو ڈی ڈی اے میں نوکری کیا ملی تھی، چند مہینوں ہی میں کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اب تو اس کے پاس بنگلہ تھا، گاڑی تھی، اور نوکر چاکر تھے۔ اگر کسی چیز کی کمی تھی، وہ تھی ٹائم کی۔ دلّی میں وہ نہ ہی مجھ سے ملنے آیا اور نہ کسی نوکری کی پیش کش کی۔ اس کی طوطا چشمی دیکھ کر مجھے خود پر بہت غصہ آیا۔ تاہم قسمت اچھی تھی کہ میرے ایک دوست نثار حسین نے اپنے ہوسٹل میں میرے رہنے کا انتظام کروایا۔

اُدھر گھر میں حالات بد سے بدتر ہونے کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ صبح شام میں اسی سوچ میں غرق رہتا کہ میں نے اپنی پیٹ پر لات کیوں ماری۔ چاہے جیسی بھی تھی نوکری تو تھی نا۔ مہینے کے دو سو پچاس روپے تو ملتے تھے۔ اب دن گزرنے کے ساتھ ساتھ جیب بھی خالی ہو رہی تھی

۔کچھ قرضہ دوست سے لیا اور کچھ گرل فرینڈ سے مگر قرضہ لینے کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے۔کوئی بھلا کب تک دیتا رہے گا۔وقت کا پہیہ کتنی جلدی گھوم چکا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ انٹرویو ہال کی طرف جاتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ٹانگیں پہلے ہی سے بھاری بھر کم ہو چکی تھیں اور ذہن ماؤف۔

پچھلے برس انٹرویو بورڈ کے ممبران میری حاضر جوابی، ذہانت اور علم کو دیکھ کر کتنے خوش ہوئے تھے۔میں نے سبھی سوالوں کے صحیح جوابات فرفر دیے تھے اور وہ بھی پورے اعتماد کے ساتھ۔ کہیں ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ میں انٹرویو دے رہا ہوں۔ہاں دل میں اتنی بشاشت تھی کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا اگر انٹرویو میں ناکام ہوا، نوکری تو کر ہی رہا ہوں۔اس لیے بے خوف ہو کر جواب دیے تھے۔انٹرویو ختم ہونے کے بعد باہر آفس کے ایک بابو سے یوں ہی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا،''ارے بھائی، آپ سمجھو نوکری مل گئی۔ہمیں بیالوجی کے لیے یا تو ایم ایس سی امیدوار ملتے ہیں یا پھر بی ایس سی بی ایڈ۔آپ ایم ایس سی بھی ہیں اور بی ایڈ بھی۔آپ کو سب سے پہلے نوکری مل جائے گی۔''

میں اچھلتا کودتا وہاں سے گھر کی جانب روانہ ہوا تھا۔قریب بیس روز کے بعد اس کی بات صحیح نکلی۔لسٹ میں میرا نام دوسرے مقام پر تھا۔نوکری کا آفر بذریعہ ڈاک ملا جس میں یہ تاکید کی گئی تھی کہ مجھے ایک مہینے کے اندر جوائین کرنا پڑے گا۔بدقسمتی سے ان دنوں میں شوروم میں اکیلا ہی تھا کیونکہ سیلز مین چھٹی پر گھر چلا گیا تھا۔دس لاکھ کا اسٹاک میرے ذمہ تھا۔سیلز مین ہوتا تو میں اپنا چارج اس کے حوالے کر کے کسی طریقے سے اپنے باس کو منا لیتا مگر یہاں تو مصیبت یہ تھی کہ شوروم چھوڑ کر دلی سے سرینگر ہیڈ کوارٹر پر جانا مشکل تھا۔حالانکہ میری عرضی پر ہیڈ آفس میں غور ہو رہا تھا مگر شوروم میں کوئی نہ ہونے کے سبب وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ چارج کس کو دیا جائے۔اسی کشمکش میں معیاد ختم ہوئی اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

گذشتہ برس کے تجربے کے سبب اس بار اندیشوں اور وسوسوں نے میرے ذہن میں جال سابُن لیا۔ میرے ذہن کے پردے پر کئی سانپ بار بار اپنا پھن ابھار رہے تھے۔

''اگر انٹرویو میں کامیابی نہ ملی تو پھر کیا ہوگا؟ بھلی چنگی نوکری تھی وہ تو چھوٹ گئی۔ اب نہ دِلّی میں مزید قیام کرنے کی گنجائش ہے اور نہ واپس جاکر کشمیر میں نوکری مل سکتی ہے۔ پھر سے بے روزگاری برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔''

''پچھلے سال بوٹنی میں دس اسامیاں خالی تھیں مگر اس بار صرف تین اسامیاں خالی ہیں۔ کیا میں کامیاب ہو پاؤں گا؟''

''ہوسکتا ہے کہ امسال اور بھی ایسے امیدوار آئے ہوں جن کی تعلیمی قابلیت میرے برابر ہو۔ اس صورت میں میرا کیا ہوگا؟''

ان سوالات کے باوجود میں انٹرویو ہال کی جانب جاتے ہوئے خود کو سمجھانے لگا۔

''کیسے بھی ہو۔ نوکری ہر صورت میں لینی ہی پڑے گی چاہے چھیننی ہی کیوں نہ پڑے۔''

سوالات......اندیشے......خدشات......!

اسی تذبذب میں میں نے اپنے آپ کو انٹرویو بورڈ کے سامنے پایا۔ اداس......اور......فکر مند۔

کئی چہرے نئے تھے۔ البتہ ایکسپرٹ وہی تھا جس نے گذشتہ سال میرا انٹرویو لیا تھا۔ دل کو نہ جانے کیوں یک گونہ تسلی ہوئی جیسے وہ کوئی جان پہچان کا آدمی ہو۔

چیئرمین نے سامنے رکھی ہوئی خالی کرسی پر مجھے بیٹھنے کو کہا اور میں نے روبوٹ کی طرح حکم کی تعمیل کی۔ متین چہرہ، کشادہ ماتھا اور چبھتی ہوئی آنکھیں۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

انٹرویو بورڈ میں ایک خاتون ممبر بھی تھی۔ وہ بڑی سج دھج کر آئی تھی۔ کانجی ورم کی ساڑی میں ملبوس، ذیورات سے لدی پھندی اور گہرا میک اپ۔ جیسے کسی ڈنر پارٹی میں شریک ہونے کے

لیے آئی ہو۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے بھی خفیف سی مسکراہٹ سے اس کو جواب دے دیا۔

چیئر مین نے میرا نام، تعلیمی قابلیت اور تجربے کے بارے میں چند سوالات کیے حالانکہ اس بارے میں اس کے سامنے فائیل میں ساری جانکاری میسر تھی۔

پھر ایکسپرٹ نے پہلا سوال داغا۔ ''مائٹو کانڈریا کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟''

میں نے جواب دینا ابھی شروع ہی کیا تھا کہ یکا یک خاتون ممبر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی مانو کسی کیڑے نے اچانک کاٹ لیا ہو۔ اپنی ساڑی کو درست کر کے اس نے کرسی کو پیچھے کی جانب دھکیل دیا اور پھر مٹکتی ہوئی اپنے پیچھے عطر کی تیز خوشبو چھوڑتی ہوئی خراماں خراماں واش روم کی جانب چلنے لگی۔ سارے ماحول میں عجیب سا ارتعاش پیدا ہوا۔

اسی کھڑ کھڑاہٹ میں میرا جواب دب کر رہ گیا۔

وہ سبھی ممبروں کی توجہ کا مرکز بن کر رہ گئی۔ میں کیا بول رہا ہوں کوئی سن ہی نہیں رہا تھا۔

وہ کمرے سے ملحق واش روم میں گھس گئی اور دروازہ بھیڑ دیا۔ تاہم ممبروں کی نظریں دروازے کی جانب جمی رہیں۔ واش روم سے آرہی ہر صدا کو وہ لوگ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس دوران میں ان کے تصورات کی پنچھی تب تک اُڑان بھرتے رہے جب تک اس نے دروازہ کھولا اور واپس آکر تبسم بکھیرتی ہوئی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

میری طرف دیکھ کر وہ پھر مسکرائی لیکن اس وقت میرا ردِّ عمل کچھ مختلف سا تھا۔ جی میں آئی کہ دو چار گالیاں سناؤں اور اس سے پوچھوں کہ کیا تمہیں یہی وقت ملا تھا واش روم جانے کے لیے؟ مگر زہر کا گھونٹ پی کر خاموش رہا۔

دریں اثنا ایکسپرٹ نے تین چار سوال ہوا میں پھینک دیے تھے۔ ہوا میں اس لیے پھینک دیے تھے کیونکہ وہ بھی خاتون ممبر کی لچکیلی اور سرسراتی ہوئی پرسنلٹی کے دام میں گرفتار ہو چکا تھا

اور واش روم میں اس کی سرگرمیوں پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے میرے کسی بھی جواب کو نہیں سنا۔ البتہ جب اسے یہ احساس ہوتا کہ میرے ہونٹوں نے ہلنا بند کر دیا ہے وہ اپنے ترکش سے ایک اور تیر پھینک دیتا۔ خیر دوسرے ممبران کا کوئی گلہ نہیں کیونکہ وہ اگر میرے جوابات سن بھی لیتے تو ان کو کیا خاک سمجھ آتا۔

چیئر مین کو جونہی احساس ہوا کہ ایکسپرٹ نے اپنا تیر کش خالی کر دیا، اس نے دوسرے ممبران سے پوچھ لیا کہ وہ کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیں لیکن سب نے انکار کر دیا۔ انجام کار اس نے اپنے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ چسپاں کر کے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔

میں اپنا سانس روک کر انتہائی بے بسی کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور بوجھل قدموں سے ہال کے باہر چلا گیا۔

باہر میرا دوست نثار میرا انتظار کر رہا تھا۔ شاید اس نے میرے چہرے سے میری کیفیت پڑھ لی۔ پوچھنے لگا۔ ''کیسا ہوا انٹرویو؟''

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ میں نے سبھی سوالات کے صحیح جوابات دیے تھے پھر بھی کسی نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ میرے جواب سن لے۔

''میرا انٹرویو ایک حسین عورت کی نذر ہو گیا۔'' لاچار ہو کر میں نے جواب دیا۔

''یار یہی تو تمہاری پرابلم ہے۔ عورت دیکھی نہیں کہ سب کچھ بھول جاتے ہو۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں کچھ بھولا نہیں۔ جب دن خراب ہوتے ہیں تو حسین عورتیں بھی ڈائن بن کر سامنے آتی ہیں۔''

میس کی طرف جاتے وقت میں نے اپنے دوست کو ساری داستاں سنائی اور پھر دوسرے ہی دن واپس سرینگر کا ٹکٹ بک کروالیا۔

☆☆☆☆☆

جھوٹا سچ

آدمی جب جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے تو اسے جھوٹ ہی سچ لگنے لگتا ہے۔ سلیم احمد بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھا جسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے ساتھ میرا تعارف اچانک اورینٹل ایوننگ کالج میں ہوا جہاں ہم دونوں اردو سیکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے پہلے ہی پوسٹ گریجویشن کی تھی اور اردو محض اپنے ذوق کو پورا کرنے کے لیے سیکھ رہا تھا، سبھی اساتذہ مجھے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سلیم احمد نے موقعے کو غنیمت جان کر دانستہ طور پر میرے قریب آنے کی کوشش کی اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

اس کی عمر تقریباً پینتیس سال کی تھی۔ اتنی ساری زندگی اس نے محض اپنی چاپلوسی اور زمانہ سازی کے سہارے گزاری تھی مگر اب حالات نے ایسی کروٹ لی تھی کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بڑے بھائی نے الگ دکان کر لی تھی اور سلیم احمد نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اسے موروثی نانبائی کی دکان پر تندور جھونکتے دیکھ لیں۔ اس نے ایوننگ کالج میں داخلہ لے لیا تا کہ وہ کسی بھی صورت میں جامعہ علی گڑھ کے ادیب اور ادیب ماہر امتحانات کامیاب کر لے اور پھر مقامی بورڈ سے میٹرک کا انگریزی مضمون پاس کر کے میٹرکولیٹ کہلائے۔ پیدائش کی جعلی سٹوفکیٹ تو اس نے پہلے ہی کسی منصف کو جل دے کر بنوائی تھی جس کی رو سے اب کاغذ پر اس کی عمر صرف پچیس سال تھی۔

میرے ساتھ اس کی دوستی روز بروز بڑھتی گئی۔ انگریزی سیکھنے کے لیے وہ میرے گھر آتا اور بارہا میرے لیے چھوٹے موٹے تحفے بھی لے آتا۔ اسے انگریزی سیکھنی تھی نہ خود امتحان میں

شریک ہونا تھا۔ بس میرے گھر آتا، اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے چلا جاتا یا پھر مجھے ساتھ لے کر سینما یا کیبرے دیکھنے چلا جاتا۔ جوانی کے دنوں میں مجھے بھی یہ سب کچھ اچھا لگتا تھا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ جامعہ کے امتحانات کے دوران ہم ساتھ ساتھ بیٹھتے۔ میں پہلے اپنی اور پھر اس کی کاپی پر جوابات لکھتا لیکن انگریزی مضمون کے امتحان میں وہ اکیلا ہی تھا اس لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ سلیم احمد نے اس کا حل یوں نکالا کہ امتحان سے قبل ہی ایک ممتحن کو رشوت دے کر پٹالیا۔ اس نے خالی جوابی کاپی امتحان ہال سے باہر نکالی اور مجھ سے جوابات لکھوا کر واپس اس کے حوالے کر دی۔ مختصر یہ کہ وہ دو سالوں میں میٹرک پاس ہو گیا۔

پھر ایک بار وہ میرے آفس آیا اور مذاقاً کہنے لگا۔ ''دیکھنا ایک دن میں بھی اسی کمپنی میں اور اسی برانچ میں ملازم ہو جاؤں گا۔ خیر رہی کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ تمہاری پوسٹ پر ہی تعینات ہو جاؤں گا۔''

میں نے اسے مذاق سمجھ کر زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن اس مائی کے لال نے تو اسے بھی سچ کر کے دکھایا۔ کچھ مدت کے بعد اس نے کمپنی میں سیلز مین پوسٹ کے لیے درخواست دی۔ اس سے پہلے کہ وہ انٹرویو میں شریک ہوتا سلیم احمد نے تینوں بورڈ ممبروں کو اپنے شیشے میں اتار لیا۔ ایک روز وہ آفس بند ہونے کے وقت پوری تیاری کر کے آیا اور مجھے ساتھ لے کر ریذیڈنسی روڈ پر ٹہلنے لگا۔ سامنے جو دیکھا تو کمپنی کے سیکرٹری صاحب نظر آئے۔ پاس پہنچا اور سلام عرض کی۔ وہ سمجھے کہ میرا کوئی قریبی دوست ہو گا اس لیے گرم جوشی سے ملا۔ دفعتاً سلیم احمد نے اسے شہر کے مشہور میریّٹ ہوٹل میں چائے پینے کی دعوت دی جسے سیکرٹری صاحب ٹھکرا نہ سکے۔ چائے پیتے ہوئے سلیم احمد نے اپنا سونے کی گلٹ چڑھا ہوا سگریٹ کیس، رانسن لائٹر اور امپورٹڈ رے بین چشمہ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ سیکرٹری صاحب ان چیزوں کو للچاتی نظروں سے دیکھنے لگے اور آخر کار ان سے رہا نہ گیا، گوگل اٹھایا اور اپنی آنکھوں پر چڑھا دیا۔

سلیم احمد اسی موقعے کی تلاش میں تھا، فوراً بول اٹھا۔ ''آپ اس میں بہت ہی خوبصورت لگ رہے ہیں۔ رکھیے، اسے آپ ہی پہن لیجیے۔''

''نہیں نہیں، یہ تو بہت مہنگا ہوگا، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

''رفیع صاحب، آپ تو کمال کر رہے ہیں۔ آپ کے آگے تو یہ کوئی چیز ہی نہیں۔ اسے رکھ لیجیے۔ دراصل میرا بھائی امپورٹڈ سامان کی تجارت کرتا ہے۔ ہمارے گھر میں ایسی بے شمار چیزیں پڑی رہتی ہیں۔''

اس کے بعد سلیم احمد نے کسی پہنچے ہوئے پیر، نور بب، کی بات چھیڑ دی جس کے مریدوں میں رفیع صاحب بھی تھے۔ باتوں سے لگتا تھا کہ سلیم احمد نے اس بارے میں پوری چھان بین کی تھی۔ باتوں باتوں میں سلیم احمد نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''چند روز قبل میری ملاقات نور بب سے ہوئی تھی۔ کسی آدمی نے، جسے میں نہیں جانتا، آپ کا ذکرِ خیر چھیڑا اور آپ کی بہت تعریف کی۔ اس پر پیر صاحب نے آپ کے لیے دعائیں مانگیں۔''

جاتے جاتے سلیم احمد نے سگریٹ کا ڈبہ اور لائٹر بھی سیکریٹری صاحب کے حوالے کر دیے۔

''یہ تم نے کیا کیا؟ نہ جان نہ پہچان۔ اتنی ساری چیزیں یوں ہی دے دیں۔'' رفیع صاحب سے الگ ہوتے ہی میں نے پوچھ لیا۔

''کوئی بات نہیں۔ وہ تمہارا افسر ہے۔ کبھی تمہارے کام آئے گا۔''

''میرے کس کام کا؟ تم نے خواہ مخواہ اتنے روپے برباد کیے۔''

''یار چھوڑو، ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ دل بڑا کیا کرو۔''

''اور اگر رفیع صاحب نے پیر صاحب سے اس بارے میں کچھ پوچھ لیا تو؟''

''یار تم بھی کتنے بھولے ہو۔ وہ ایک مجذوب فقیر ہے۔ اس سے سوال کرنے کی ہمت

کس میں ہے۔ سب لوگ صرف اس کو سنتے رہتے ہیں۔"

اسی طرح سلیم احمد نے دوسرے ممبروں کی کمزوریوں کا پتہ لگا کر ان کو بھی زیر بار کر لیا۔ پھر انٹرویو کے روز تینوں حیرت سے اس کو دیکھتے رہ گئے اور اپنے من کا چور ایک دوسرے سے چھپانے کی لگا تار کوشش کرتے رہے۔ ہفتے بھر میں سلیکشن لسٹ شائع ہوا اور سلیم احمد کا نام دسویں نمبر پر تھا۔ سلیم احمد لسٹ دیکھ کر سب سے پہلے میرے پاس آیا اور خوش خبر سنائی۔ میں تو اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس وقت مجھے یقین ہوا کہ اگر اس نے یہ کہا ہوتا کہ میں ایک دن تمہاری کرسی پر بیٹھ جاؤں گا تو وہ بھی ممکن تھا۔

نوکری بدلنے کے باعث میں سلیم احمد سے الگ ہو گیا لیکن مجھے وقتاً فوقتاً اس کی خیر خبر ملتی رہتی تھی۔ اس نے اپنی ٹھاٹ باٹ قائم رکھنے کے لیے لمبے لمبے ہاتھ مارے جس کے سبب تینوں افسر، جنہوں نے اس کا انٹرویو لیا تھا، پریشاں ہو گئے اور ایک دوسرے پر تہمت لگانے لگے کہ اسی کی وجہ سے سلیم احمد کمپنی میں ملازم ہو گیا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ تینوں برابر کے ذمے دار تھے۔ البتہ سلیم احمد ان باتوں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی ہی دھن میں مست رہا۔

جن دنوں وہ دہلی میں تعینات تھا، برانچ منیجر نے اسے چھٹی دینے سے انکار کر دیا۔ بہت منت سماجت کرنے کے باوجود منیجر کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اس نے مسکراتے ہوئے منیجر کے حکم کی تعمیل کی اور کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔ سلیم احمد کو معلوم تھا کہ منیجر کی سب سے بڑی کمزوری دہلی کی پوسٹنگ ہے کیونکہ اس کی بیوی دہلی میں نوکری کرتی ہے اور وہ پچھلے دس سال سے دہلی سے باہر نکلتا ہی نہیں۔ قریباً ایک مہینہ گزر جانے کے بعد وہ بڑے رازدارانہ انداز میں منیجر کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "بھگوان لال جی، سنا ہے آجکل تبدیلیاں زور و شور سے ہو رہی ہیں۔ مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کو کولکتہ بھیجا جا رہا ہے۔"

تصدیق کے لیے سلیم احمد نے ٹیلی فون پر منیجر صاحب کی بات ہیڈ کوارٹر کے متعلقہ کلرک

سے کرادی جس کو اس نے پہلے ہی سے پٹی پڑھائی تھی۔ بھگوان لال گھبرا گیا اور مصیبت سے بچ نکلنے کا راستہ ڈھونڈنے لگا۔ دوسرے روز سلیم احمد نے تجویز پیش کی کہ وہ ہیڈکوارٹر جاکر اس کی تبدیلی رکوا سکے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بھگوان لال مان گیا اور ساتھ ہی ریل ٹکٹ کا خرچہ بھی دے دیا۔ سلیم احمد ہیڈکوارٹر میں، جہاں اس کا گھر بھی تھا، دس بارہ روز کی چھٹیاں بتا کر واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پوسٹنگ فائیل کا پہلا اور دوسرا ترمیم شدہ جعلی نوٹ پیج اور پوسٹنگ آرڈر تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس نے منیجر کی تبدیلی رکوائی ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی اور سلیم احمد یوں ہی معرکے طے کرتا رہا۔ ان سب ریاکاریوں کی تفصیل دینا یہاں ممکن نہیں ہے۔

بہر حال میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سلیم احمد نے میرے ساتھ کبھی کوئی جعلسازی یا بے ایمانی نہیں کی البتہ میرے کان اس کے قصے سُن سُن کر پک گئے۔ یہ عجیب سا اتفاق ہے کہ سلیم احمد کو ایک بہت ہی نیک اور سگھڑ بیوی ملی جو اس کی ان کارستانیوں سے تنگ آ چکی تھی۔ سلیم احمد ہر رات طرح طرح کی ڈینگیں مارتا اور نعیمہ بے چاری خاموشی سے سنتی رہتی مگر منہ سے کبھی اُف تک نہ نکالتی۔ سلیم احمد مسلسل چھ برس تک ہر سال اس کی گود میں ایک نیا بچہ ڈال دیتا جس کے سبب وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی۔

نعیمہ نے شادی سے پہلے کئی سنہرے خواب دیکھے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ سب خاک میں ملتے گئے۔ بچے ایک ایک کر کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ کمسن تھے، باپ کی شیخیوں میں آکر خود کو رئیسوں کی اولاد سمجھنے لگے اور بڑے بڑے تاجروں اور سمگلروں کے بگڑے ہوئے بچوں کی سنگت میں پڑ گئے۔ فطرت کے تقاضے کے عین مطابق انہوں نے دوستوں کے عادات قبول کیے۔ پہلے چرس گانجے کا مزہ چکھا اور پھر راتوں رات امیر بننے کے چکر میں ان کا دھندہ کرنے لگے۔ ابتدا میں انہیں کافی کامیابی ملی۔ پولیس کی انہیں کوئی فکر نہ تھی کیوں کہ انہیں پورا وشواس تھا کہ سارے شہر میں ان کے باپ کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ انہیں یقین تھا کہ خدانخواستہ

کبھی کوئی مصیبت آ بھی گئی تو ان کا باپ انہیں ضرور بچا لے گا۔لیکن ماں باپ تھے کہ انہیں ان خرافات کی کوئی خبر بھی نہ تھی۔

آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ایک روز پولیس نے دونوں بڑے لڑکوں کو حراست میں لے لیا اور منشیات کے دھندے میں ملوث ہونے کے باعث ان پر مقدمہ چلایا۔سلیم احمد نے اپنے بیٹوں کو بچانے کے لیے جگہ جگہ ہاتھ پاؤں مارے مگر ہر اس آدمی نے ،جس پر وہ آس لگائے بیٹھا تھا،سلیم احمد کو پہچاننے سے انکار کیا کیونکہ معاملے کو ذرائع ابلاغ نے اتنا اچھالا کہ کوئی بھی افسر اپنی ساکھ داؤ پر نہیں لگانا چاہتا تھا۔سلیم احمد نے اپنی ساری جمع پونجی پانی کی طرح بہا دی اور اس کے وکیلوں کے پاس جتنے بھی داؤ پیچ تھے،وہ سبھی آزمائے مگر کسی کو کامیابی نہ ملی ۔انجام کار دونوں لڑکوں کو دو سال قید کی سزا ہوگئی۔

جس روز عدالت نے فیصلہ سنایا، اسی روز سلیم احمد کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ڈاکٹروں نے جان تو بچالی مگر سلیم احمد کو نقاہت اور ضعیفی محسوس ہونے لگی۔پھر عمر کا تقاضا بھی تو تھا۔کاغذ پر بے شک آپ نے عمر دس سال کم لکھوائی ہو مگر جسم کی گھڑی تو واپس نہیں گھما سکتے۔وہ تقریباً دو مہینے بستر پر پڑا رہا۔ نیند کی گولیوں کے باوجود اس کی آنکھیں نیند کو ترسنے لگیں۔بار بار وہ خود سے یہی سوال کرتا رہا۔

''میری جان پہچان کے اتنے سارے لوگ تھے وہ سب کہاں چلے گئے؟ کیا اس بھری دنیا میں میرا کوئی بھی ہمدرد نہیں ہے؟ کیا میں عمر بھر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا؟ خود سے جھوٹ بولتا رہا؟''

☆☆☆☆☆

حسرتوں کا مدفن

رجنی اپنے شوہر کو لے کر دہلی تو پہنچ گئی مگر اس کی گردن میں طوق اطاعت نہ ڈال سکی۔ وہ اسے کہیں ایسی جگہ چھپانا چاہتی تھی جہاں بس وہ ہو، اس کا پتی ہو اور کوئی دوسرا نہ ہو۔ رجنی کا یہ رویہ اس تحقیر کا ردِ عمل تھا جس کا سامنا وہ بچپن ہی سے کرتی آ رہی تھی۔ اس کی جلد کوّے کی طرح کالی تھی اور وہ بھی ایسے لوگوں کے درمیان جن کے گورے پن کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ رجنی نے لمحہ لمحہ اس ذلّت کے ٹیکے کو اپنے نفس میں جذب کر لیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے یہی سوچا کرتی۔ ''بھگوان نے پیدا ہی ایسا کر لیا اس میں میرا کیا قصور۔ لوگ مجھ سے اتنی حقارت کیوں کرتے ہیں؟ بچپن میں ماں باپ کی چھاتی کا پھوڑا بنی رہی، سکول میں لڑکیاں مجھ سے دور بھاگتی رہیں اور اب شادی کے بعد پتی کے پیار کو ترس رہی ہوں۔''

کہتے ہیں جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ انسان کی سوجھ بوجھ اور ہمہ دانی اس میں کچھ نہیں کر پاتی۔ مگر عورت کیسی بھی ہو اپنی ذلّت برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ساری دنیا سے لوہا لینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ رجنی کے ماں باپ زندہ ہوتے تو وہ ان کا گریباں پکڑ کر پوچھ لیتی۔ ''تم لوگوں نے میری شادی ایسے آدمی سے کیوں کر لی جو اتنا شکیل اور خوبرو ہے کہ اس کے چہرے پر آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ میرے ہی جیسے چہرے مہرے کے کسی لڑکے سے کی ہوتی تو یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ تمھاری وجہ سے میری زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔''

دراصل والد نے کم سنی میں اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے سے طے کر لی تھی اور پھر دو مہینے کے اندر ہی سات پھیرے لگوائے تھے۔ ان دنوں دستور ہی کچھ ایسا تھا کہ والدین کے

سامنے لڑکی چوں بھی نہ کر پاتی تھی۔ ماں کیا، سبھی رشتے دار دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گئے۔ شادی سے پہلے نہ لڑکی نے اپنے منگیتر کو دیکھا اور نہ لڑکے نے اپنی منسوبہ کو۔ ان کی عمر تھی ہی کتنی کہ شادی کا مطلب سمجھتے۔ دونوں ہمجولیوں کی طرح ایک ساتھ پلتے رہے، آپس میں کھیلتے رہے اور پھر بلوغ کو پہنچ گئے۔ رگھوناتھ کو جونہی اس بات کا احساس ہوا کہ اسے زندگی بھر اس بدصورت ہمجولی کے ساتھ نباہ کرنا پڑے گا، اس کے دل میں عجیب سی کدورت پیدا ہوگئی اور وہ اسے کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ رجنی اس کو پتنی کے روپ میں قطعی قبول نہ تھی۔ اس سے بھی زیادہ کوفت رگھوناتھ کو اس وقت ہوتی تھی جب اس کے یار دوست اس کو چڑھاتے تھے کہ ایک بگلے کی شادی کوّی سے ہو چکی ہے۔ اس کی حالت یہ تھی کہ نہ نگلتے بنتی تھی اور نہ اُگلتے۔ ناچار و بے بس دونوں اک دوسرے کا بوجھ زندگی بھر اٹھاتے رہے۔

رجنی کو اس ناسازگاری سے بچنے کی ایک ہی سبیل نظر آئی اور وہ تھی اپنے شوہر کو لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جانا جہاں نہ اس کی تندمزاج ساس ہو جو اٹھتے بیٹھتے طعنے دیتی تھی، نہ فرار پسند سسر ہو جو بات بات پر گھر سے بھاگ کر دور پہاڑی پر دیوی کے چرنوں میں شرن لیتا تھا اور نہ ہی دیور نندیں ہوں جو ہر وقت اس کے سر پر کھڑے رہتے تھے۔ ایک روز وہ رگھوناتھ سے گویا ہوئی۔
”کیا فائدہ آپ کے ایم اے بی ٹی کرنے کا۔ ڈیڑھ سو تنخواہ ملتی ہے۔ گھر کا خرچہ بھی پورا نہیں ہوتا۔ وہاں دہلی میں میرے جیجا جی کو دیکھو۔ صرف بی اے بی ٹی ہیں۔ سکول میں پانچ سو ماہانہ ملتے ہیں۔ پھر ٹیوشنوں سے بھی دو تین سو کماتے ہیں۔ مزے سے جی لیتے ہیں۔“

”ہاں، میں بھی بہت دنوں سے اس بارے میں سوچ رہا ہوں مگر یہاں اتنے بڑے کنبے کو کس کے بھروسے چھوڑ دوں، سمجھ میں نہیں آتا۔“

”ان کا کیا..... پتا جی ہیں نا..... پھر آپ کے دو بھائی بھی تو ہیں...... آج نہ کل وہ بھی کمائیں گے۔ ہم دِلّی سے سو دو سو روپے ہر ماہ بھیج دیا کریں گے۔“

رگھوناتھ کو، جو ہر روز کی جھک جھک سے تنگ آچکا تھا، یہ مشورہ معقول نظر آیا۔ ہفتے بھر میں اس نے اپنا بوریا سنبھالا اور دہلی جا کر ہی دم لیا۔

دہلی پہنچ کر رجنی کو ایسا لگا جیسے وہ عمر قید سے رہائی پا چکی ہو۔ قیدی پرندے کا پنجرہ اچانک کھول دیا جائے وہ باؤلا ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔ وہ پھر سے اُڑ جاتا ہے اور کھلے آسمانوں میں اندھا دھند پرواز کرنے لگتا ہے۔ اسے نہ بھوک کی فکر رہتی ہے اور نہ سفر کی تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ اسے اس بات کا خیال بھی نہیں رہتا کہ آزادی اپنے صیاد پیدا کرتی ہے۔

کبھی کبھی انسان اپنی تخریبی فطرت کے سبب ایسے کام کر جاتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا گلستاں اجڑتا ہے۔ رجنی نے سوچا تھا کہ دہلی جا کر وہ رگھوناتھ کو اپنے بس میں کر لے گی مگر ہوا اس کے الٹ۔ رگھوناتھ کے ذہن میں پہلے ہی سے اتنی بدظنی تھی کہ وہاں بھی ان کے بستر الگ الگ رہے۔ تاہم ایک روایتی ہندستانی عورت کے ناتے وہ ہمیشہ یہ زعم پالتی رہی کہ جائے گا کہاں، ایک نہ ایک دن رگھوناتھ اس کی شرن میں ضرور آئے گا۔ اس یقین کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود شوہر نے اسے طلاق نہیں دی تھی۔ رجنی ساری عمر ایک پتی برتا عورت کا روپ بھرتی رہی جبکہ رگھوناتھ بلاناغہ نان ونفقہ مہیا کرتا رہا۔

عورت کو جنسی تسکین نہ ملے وہ اکثر بھگوان کی شرن میں چلی جاتی ہے۔ سو رجنی بھی سادھو سنتوں اور آشرموں کے چکر لگاتی رہی اور ان کے دیے ہوئے گنڈے تعویزوں سے اپنی زندگی کی خالی جگہیں پُر کرتی رہی۔ اتنی تو تسلی تھی کہ ساس سسر کا بکھیڑا ختم ہو چکا ہے۔ وہ اپنی اس کامیابی پر دل ہی دل میں مطمئن تھی۔ اب وہ ایک نئے ماحول میں پہنچ چکی تھی جہاں وہ اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بسانے میں مصروف ہوگئی جس کی تخلیق، تصور سازی سے لے کر تکمیل تک، صرف اس کے ذمے تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اس نے بھی بچپن میں ایک حسین گھر بسانے کا خواب دیکھا تھا اور اب وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں، رجنی نے دنیا کی پرواہ کیے

بغیر اپنی اڑان کی سیمائیں بھی بلند تر کرلیں۔

بہرکیف دہلی دونوں میاں بیوی کے لیے اجنبی شہر تھا جہاں ہر سو بھیڑ ہی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ ہر چہرہ انجان تھا اور جو چند جانے پہچانے لوگ تھے وہ خال خال ہی دکھائی دیتے تھے۔ دونوں اس بھیڑ میں کھو جانے کے خواہاں تھے۔اب نہ ماں باپ کی ہدایتیں تھیں اور نہ ساس سسر کے جھگڑے۔ رجنی نے اپنے اردگرد سہیلیوں اور نئے جانکاروں کا ایک جال بُن لیا۔اُدھر شوہر صبح سویرے لنچ کا ڈبہ لے کر دفتر نکل جاتا اِدھر رجنی مونگ پھلیاں کھاتی ہوئی دہلی کی سڑکیں ناپنے نکل جاتی۔ کبھی بہن کے گھر، کبھی سہیلیوں کے پاس اور کبھی اجنبی رشتے داروں کے ٹھکانوں پر جو کُکرمتوں کی مانند پھوٹ پڑے تھے۔ گھر میں نہ کوئی پوچھنے والا تھا اور نہ ہی ٹوکنے والا۔البتہ پابندیٔ وقت کا احساس اتنا شدید تھا کہ پتی کے گھر لوٹنے سے پہلے گھر میں حاضر ہو جاتی۔

اُدھر رگھوناتھ کو نوکری ملنے کی دیر تھی کہ اس کے بھی پر پرزے نکل آئے۔ آزادی یک طرفہ نہیں ہوتی۔ وہ بھی کھلی فضاؤں میں پر تولنے لگا۔ اجنبی دنیا.....اجنبی لوگ.....اجنبی رشتے.....! نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بندھو۔ دائیں بائیں غرض ہر طرف شرابی اور عیاش دوست! روزانہ گھر سے باہر رہنا، محفلیں سجانا، قحبہ خانوں کے چکر لگانا اور شراب پینا اس کا معمول بن گیا۔ اخراجات اتنے بڑھ گئے کہ اپنے سوا باقی ساری دنیا ہیچ لگنے لگی۔ آبائی گھر کی یادیں سب ورق پارینہ بن کر رہ گئیں۔

دہلی آئے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پاس ہی میں ایک اسکول کی استانی پورنیما مہتا دل دے بیٹھی۔ اجلی رنگت، پنجابی ڈیل ڈول اور خوش گلو۔ بس میں آتے جاتے ملاقات ہو جاتی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ پورنیما کی قربت سے رگھوناتھ اپنی زندگی کے خلا کو پُر کرنے لگا۔ نزدیکیاں اتنی بڑھ گئیں کہ باقی سارے وجود دھندلے پڑ گئے۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ رجنی کو کچھ خبر بھی نہ ہوئی۔ جب آنکھ کھلی تو سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ رگھوناتھ اب گھر آتا تھا تو مہمان کی

مانند، رہتا تھا تو بیگانے کی طرح اور جاتا تھا تو مسافر کی طرح۔ رجنی میں اسے ایسی ڈائن نظر آ رہی تھی جو کھائے تو منہ لال، نہ کھائے تو منہ لال۔

رجنی حیران و پریشان تھی۔ اس نے سوچا کچھ تھا اور ہو رہا کچھ اور ہی تھا۔ رکھیل سے چوکس رہنا اور طوائفوں کی خبر گیری کرنا عام گرہستوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ بڑی ہمت کر کے اس نے پورنیما کے گھر اور آفس میں کئی بار ہلّا کیا اور جتنا ہو سکا اس کو بُرا بھلا کہہ کر واپس چلی آئی مگر دیگر طوائفوں کے منہ لگنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس کے لیے دل گردہ چاہیے، وہ کہاں سے لاتی۔ اور پھر ایک طوائف ہوتی تو چلی بھی جاتی، وہاں تو پورا بازار سجا ہوا تھا کہاں کہاں چلی جاتی۔

رگھوناتھ ان سب باتوں سے لاتعلق اپنی دُھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ مستی کا کیا! وہ تو اندھا بنا دیتی ہے۔ اس نے نہ جانے کس کوٹھے پر آتشک بیماری مول لی۔ بہت علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ پھر سوچنے لگا۔

"باڑھ میں جائے یہ بیماری، اچھا ہی تو ہے دس سال نہیں جئیں گے، دس دن جئیں گے۔ اس نرک سے تو بہتر ہے۔"

وہ زندگی کے باقی ماندہ دن پہلے کی طرح بے خوف و خطر جینے لگا۔ اُدھر بیوی آنسو بہاتی رہی، چھاتی پیٹنے لگی اور شوہر کو بدنام کرتی رہی مگر دوسروں کو اس کی نجی زندگی سے کیا لینا دینا تھا۔ منہ زبانی سب دردمندی جتاتے۔ رشتے داروں کی ہمدردی پانے کے لیے وہ کشمیر چلی گئی مگر وہاں بھی کسی نے کان نہیں دھرا۔ بس تھوڑی بہت ہمت بندھائی اور دو چار بول غمخواری کے بول دیے۔ دراصل جو سننے والے تھے وہ تو سورگ سِدھار گئے تھے اور جو بچ گئے تھے انھوں نے پہلے ہی رجنی کا نام صفحۂ ہستی سے حذف کیا تھا۔ یہ وہی آبائی وطن تھا جہاں سے رجنی اپنے خاوند کو ورغلا کر لے گئی تھی پھر وہاں اب کون تھا جو اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ میاں بیوی دونوں کی حالت اس سانپ کی سی تھی جن کے منہ میں چھچھوندر ہو، نگلے تو اندھا اُگلے تو کوڑھی۔ اندر اندر دونوں کا دل جلتا

رہا لیکن اوپراوپر فرحت کا خول چڑھائے بیٹھے تھے۔

آخر کار وہی ہوا جس کا رگھوناتھ کب سے انتظار کر رہا تھا۔ نوکری سے سبکدوش ہونے سے دس سال پہلے ہی وہ بھگوان کو پیارا ہو گیا۔ اپنی نگوڑی ناٹھی بیوی کے لیے صرف پنشن کی رقم چھوڑ گیا جبکہ باقی جائیداد کی وصیت اسکول کے غریب بچوں کے نام لکھ کر چلا گیا۔ رشتے داروں میں وصیت نامے کا چرچا بہت دنوں تک رہا۔

''میں، رگھوناتھ سپرو ولد جگن ناتھ سپرو ساکن ۵۳، بلاک سی، ٹیگور گارڈن، دہلی اعتراف کرتا ہوں کہ میری شادی میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ رہا ہے۔ میں نے اپنی ازدواجی زندگی کانٹوں کے بستر پر گزاری ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں اس زندگی سے فرار حاصل نہیں کر سکا۔ ہوسکتا ہے اس میں میرے اضمحلال یا میری انفعالیت کا دخل ہو۔

میری بیوی چغد ہے۔ دوسروں کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اس نے میری اور اپنی زندگی تباہ کر لی۔ چنانچہ اس کی کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے اس کی ضروریاتِ زندگی محدود ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ لوگ بہلا پھسلا کر اس کی جائیداد ہڑپ لیں گے۔ اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد گورنمنٹ سے واجب الادا رقوم میں سے صرف پنشن اور گریچوٹی کی رقم میری بیوی رجنی سپرو کو دی جائے جو اس کو کفایت شعاری سے جینے کے لیے کافی ہوگی جبکہ باقی واجب الادا رقوم اور جائیداد، جس میں گریٹر کیلاش میں میرا پلاٹ، انشورنس پالیسی، بنک وڈاکخانے کے کھاتے اور معیادی ڈیپازٹ شامل ہیں اور جن کی تفصیل میں منسلک کر رہا ہوں، ٹرسٹ کی تحویل میں دی جائیں گی۔ یہ ٹرسٹ میرے نام سے حکومت کی نگرانی میں قائم ہوگا جس کے تین ممبر ہوں گے۔ محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر ایجوکیشن، میرے آخری اسکول کے، جہاں میں گزشتہ پندرہ سال سے کام کر رہا ہوں، پرنسپل اور وائس پرنسپل۔ میری غیر منقولہ جائیداد فروخت کر کے ساری رقم ٹرسٹ کے نام پر بنک میں جمع ہوگی۔ اس رقم پر جتنا بھی سالانہ بیاج ملتا رہے گا، اس کو ہر سال میرے

اسکول کے سب سے غریب اور ذہین تین بچوں میں وظیفے کے طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ دستخط رگھو ناتھ سپرو، پرنسپل۔''

رگھوناتھ نے اپنی فہم کے حساب سے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی مگر رجنی اس لحاظ سے بھی بڑی ڈھیٹ نکلی۔ بیاسی سال کی عمر تک بہن کے گھر میں پڑی رہی۔ شوہر کے مرنے کے ترت بعد رشتے داروں نے بہت پیار جتایا مگر جونہی انھیں وصیت کے بارے میں پتہ چلا تو سبھی نے دوریاں اختیار کر لی۔ البتہ بہن تو اپنا خون تھی وہ توتے کی طرح چشم نہیں پھیر سکی۔ آخری دم تک رجنی کو جھیلتی رہی۔

دونوں میں سے کون سعادت مند تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے.....رگھوناتھ، جو زندگی کی صعوبتوں سے جلدی چھٹکارا پا کر رخصت ہو گیا.......یا پھر.......رجنی جو شوہر کی بے التفاتی کے باوجود بیاسی سال تک ڈِھٹائی سے جیتی رہی.......اس کا فیصلہ میں آج تک نہیں کر پایا۔

☆☆☆☆☆

یونین لیڈر

وہ خود کو ضرورت سے زیادہ ذہین سمجھتا تھا۔ قصور اس کا نہیں تھا کیونکہ وہ اندھوں میں کانا راجہ تھا۔ اس کی بھرتی ان دنوں ہوئی تھی جب ملک کا بٹوارا ہوا اور ڈاک خانے ملازموں سے خالی ہو گئے۔ آدھے ملازم ادھر رہے اور آدھے سرحد کے پار چلے گئے۔ یوں بھی ڈاک خانہ ایسا محکمہ تھا جہاں نہ ڈگری دیکھی جاتی تھی اور نہ ڈویژن۔ بس پڑھنا لکھنا، جمع تفریق اور ضرب تقسیم آنا چاہیے تھا۔ کہیں کہیں تو پورے خاندان کا خاندان ہی ڈاک خانے میں کام کرتا تھا۔ کرتا کیوں نہیں! آزادی سے پہلے ڈاک خانے کی ملازمت کرنا بڑے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ ان دنوں ملازم دفتروں سے جھولیاں بھر بھر کر گھر نہیں آتے تھے۔ یوں ہی کسی نے عید دیوالی کے دن بخشش کے طور پر ایک آدھ آنہ دے دیا تو بڑی بات تھی۔

موتی لال کی شکل وصورت بری نہ تھی۔ درمیانہ قد، شکیل، ہمّتی اور پر اثر لہجہ۔ اس کے من میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی رہی کہ اس کے کئی رفیق کار امتحان دے کر انسپکٹر بن گئے جبکہ وہ تین بار اسی امتحان میں شریک ہونے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکا۔ ادھر انسپکٹروں کے گھروں میں ہن برسنے لگا اور ادھر اس کی چھاتی پر سانپ لوٹتا رہا۔

بہر حال ایک در بند ہو جاتا ہے، ہزار در کھل جاتے ہیں۔ آزادی کے بعد جب پہلی آل انڈیا پوسٹل سٹرائیک ہوئی تو موتی لال نے بڑی سرگرمی سے اس میں حصہ لیا۔ تیل کی طرح وہ ہر جگہ پہنچ جاتا، اپنے رفیقوں کو سٹرائیک کرنے پر آمادہ کرتا اور سٹرائیک کے دوران ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کر لیتا۔ اس کی کارکردگی کو دیکھ کر قومی لیڈروں نے اسے سرکل سیکریٹری بنا لیا۔ پھر تو

اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ وہ لوگ جو اسے آگے نکل گئے تھے اب اس کے پاس حاضری دینے لگے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں موتی لال ان کے خلاف اعلیٰ افسروں سے شکایت نہ کرے تب وہ کہیں کے نہ رہ جائیں گے۔ تبادلہ تو ہوگا ہی ساتھ میں تادیبی کارروائی بھی ہو سکتی تھی۔ ابتدا میں تہنیتی تحفے آتے رہے اور پھر براہ راست زرِ نقد۔ ایک ایسا بھی وقت آیا کہ موتی لال کی سفارش سے نوکریاں ملنے لگیں یا پھر ہر اپوئنٹمنٹ پر مخصوص شرح باندھی گئی۔ اتنا ہی نہیں اس نے ایکسٹرا ڈیپارٹمنٹل ایمپلائیز کی تنخواہ بڑھانے کے لیے اپنی ساری قوت صرف کی کیونکہ اِدھر ان کی تنخواہ بڑھ رہی تھی اور اُدھر اس کی تجوریاں بھرنے لگی تھیں۔ انسپکٹر تو کورنش بجاتے ہی تھے مگر ان کا قد مزید کم کرنے کے لیے اس نے جنرل لائن ملازموں کی تنخواہیں بڑھوا دیں۔

اس کے علاوہ بھی ایک اور کانٹے کی خلش اسے ستاتی رہی۔ خوش شکل ہونے کے سبب امرد پرستوں نے اس کو بچپن میں بہت ستایا تھا اور اب وہ اس کا انتقام غریب لاچار لڑکیوں سے لیتا تھا۔ نوکری کا جھانسا دے کر یا پھر تادیبی سزا سے بچانے کی خاطر! اپنے احساس کمتری کو کم کرنے کے لیے وہ اپنے کنبے کو فراموش کر کے شراب اور شباب میں ڈوبا رہتا۔

اِدھر وہ ترقی پا کر قومی سطح پر جنرل سیکریٹری کیا بنا، محکمے کے اعلیٰ حکّام بھی اسے ڈرنے لگے۔ وجہ.....! بس وہی تبدیلی کا ڈر.... یا پھر شکایت کا خوف....! چنانچہ ان دنوں فضا میں سوشلزم کی بوٗ چاروں اور پھیل چکی تھی اس لیے کوئی بھی آدمی یونین لیڈروں کے منہ نہیں لگتا تھا۔

اتفاق سے وہی ٹائم تھا کہ میری تقرری بھی ڈاک محکمے میں ہوئی۔ ابھی پروبیشن پر ہی تھا کہ میں اپنے نزدیکی ڈاک خانے میں جانکار لوگوں سے علیک سلیک کے لیے چلا گیا۔ موتی لال اس وقت ڈاک خانے کا پوسٹ ماسٹر تھا۔ میرا تعارف کرایا گیا مگر موتی لال پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور مجھے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اہانت کے باوجود میں نے کرسی پر بیٹھنا ہی مناسب سمجھا۔

''کب پاس کیا آئی پی ایس؟'' موتی لال نے چپی توڑی۔

''یہی کوئی ایک ڈیڑھ سال ہو گیا۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

اتنی دیر میں اس نے میز پر رکھا ہوا ولز فلٹر کا پیکٹ ہاتھ میں اٹھا کر مجھے پیش کیا۔ غرض یہ تھی کہ مجھے اس بات کا احساس دلا دے کہ وہ میری برتری تسلیم نہیں کرتا۔ میرے لیے یہ ایک اور جھٹکا تھا۔

میں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی کوشش کی۔

''نہیں، میں یہ سگریٹ نہیں پیتا۔ یہ بھی کوئی پینے لائق سگریٹ ہے۔ یہاں ہمارے علاقے میں تو بچے بھی ایسا ہلکا سگریٹ نہیں پیتے۔'' میں نے پتلون کی جیب سے چار مینار کا پیکٹ نکال کر اس کو پیش کیا۔ ''میں پانچویں جماعت سے لگاتار چار مینار پی رہا ہوں۔ لیجیے، آج کی بار میرا ہی برانڈ پی لیجیے۔''

اس کی آنکھیں سگریٹ پیکٹ دیکھ کر چندھیا گئیں۔ میرا وار صحیح نشانے پر لگا تھا البتہ اس نے جلدی ہی خود کو سنبھالا۔

''یوں تو میں اس آفس کا پوسٹ ماسٹر ہوں مگر یونین جنرل سیکریٹری ہونے کے سبب میں ڈائریکٹر جنرل کے برابر ہوں۔ میں وہ واحد شخص ہوں جو کبھی بھی اور کہیں بھی اس سے براہِ راست مل سکتا ہے۔'' اس نے پھر اپنی دھاک جمانے کی کوشش کی۔ ''دراصل میں نے اپنی زندگی مزدوروں اور پسماندہ لوگوں کے لیے وقف کی ہے۔ اس ملک میں جہاں غریب طبقوں کا استحصال ہو رہا ہے، آئے دن کسان فاقہ کشی سے مر جاتے ہیں وہاں دس بڑے سرمایہ دار گھرانے، جن میں ٹاٹا سرِ فہرست ہے، مسلسل اپنی دولت کے انبار لگا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارا سنگھرش کرنا ضروری بنتا ہے۔''

''دس نہیں بیس گھرانے کہیے۔ اس وقت بڑلا سرِ فہرست ہے۔'' میں نے اس کی تصحیح کی

اور پھر ان گھرانوں کی کُل سمپتی کی تفصیل دی۔ ساتھ ہی اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتا رہا۔

''لگتا ہے آپ بھی میری طرح کمیونزم میں یقین رکھتے ہیں۔''

''نہیں۔ میں کسی ازم وِزم میں یقین نہیں رکھتا۔ مجھے صرف انسانیت پر بھروسہ ہے۔''

یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

ہمارے درمیاں باضابطہ رسہ کشی اس وقت شروع ہوئی جب میں نے اسی پوسٹل ڈویژن کا چارج سنبھالا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ بذات خود وہاں موجود نہ تھا بلکہ دہلی میں جنرل سیکریٹری کے فرائض ادا کر رہا تھا اور وہیں سے کشمیر ڈویژن کی لگام پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے آتے ہی بڑے پیمانے پر ملازموں کا تبادلہ کیا حالانکہ مجھے اپنے ہی ہیڈ کلرک نے تنبیہ کیا تھا کہ موتی لال اس کارروائی سے ناراض ہو جائیں گے۔ دراصل میں نے ہیڈ کلرک کی مجوزہ تبدیلیوں کو نظر انداز کیا تھا کیونکہ اس نے ان تبدیلیوں کے عوض میں کافی سارا روپیہ بطور رشوت اکٹھا کیا تھا اور وہ رقم اسے لوٹانی پڑی۔ نتیجتاً وہ شرارت پر اتر آیا۔

اسی رات موتی لال کا ٹیلیفون آیا۔ ابھی وہ کچھ بول ہی نہ پایا تھا کہ میں نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''موتی لال جی، میں نے ڈویژن میں کچھ ٹرانسفر آرڈر ایشو کیے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ موتی لال جی ناراض ہو جائیں گے مگر میں نے دوٹوک جواب دیا کہ ان کو جتنا میں جانتا ہوں اتنا کوئی نہیں جانتا۔ وہ تو ڈائریکٹر جنرل کے برابر ہیں اور جن کا کوئی نہیں ان کے وہ مددگار ہیں۔ وہ کسی کا استحصال برداشت نہیں کرتے۔ پھر معمولی سے ڈویژن کی ٹرانسفرس میں انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟ مجھے لگتا ہے یہ لوگ آپ کا نام لے کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔''

میری باتیں سن کر وہ خاموش ہو گیا لیکن اس کے دل میں جو آگ دہک رہی تھی وہ کم نہ

ہوئی۔اس نے اعلیٰ افسروں کے پاس میری شکایت کی، پھر منسٹر کو خط پر خط لکھے اور جب دال نہ گلی تو ایک دن سرینگر آکر مجھ سے ملا۔ بڑی چکنی چپڑی باتیں کرنے لگا۔میری شخصیت اور میرے اصولوں کی تعریف کرنے لگا اور آخر کار اپنا مدعا بیان کیا۔

''سر آپ بھی کشمیری پنڈت ہیں اور میں بھی۔ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے۔اس محکمے میں کمانے کے چند ہی مواقع مل جاتے ہیں۔سب سے بڑا موقع تو ایس ایس پی لیول پر ملتا ہے۔ آپ اس موقعے کو کیوں گنواتے ہیں۔یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔''

''کتنی کمائی ہوسکتی ہے سال میں؟''میں نے معصوم سا چہرا بنا کر پوچھا۔

''یہی کوئی تیس چالیس ہزار۔''

''یہ تو کچھ بھی نہیں موتی لال جی۔میں نے سنا ہے کہ آپ کو دِلّی میں گورنمنٹ کا بہت بڑا مکان ملا ہے جبکہ آپ کا وہاں پر اپنا گھر بھی ہے۔''اس کے چہرے کا جائزہ لے کر میں پھر گویا ہوا۔ ''آپ اس مکان کو ایک سال کے لیے مجھے سونپ دو۔میں وہاں پر ایسکارٹ سروس شروع کروں گا اور ضرورت مندوں کو لڑکیاں سپلائی کروں گا۔ایک سال کے بعد آپ کو پچاس ہزار دے دوں گا اور خود پچاس ہزار رکھ لوں گا۔کہیے منظور ہے۔''

میری بات سن کر وہ سکتے میں آگیا مگر جلدی ہی کروٹ بدل کر بولا۔''سر کیوں مذاق کر رہے ہیں؟''

''نہیں میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔اگر غلط کام کرنا ہی ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔''

وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور اپنا سا منہ لے کر واپس چلا گیا۔بد قسمتی سے انہی دنوں مجھے اپنے افسر سے اَن بن ہوگئی۔انجام کار مجھے وہاں سے ڈیپوٹیشن پر آرمی پوسٹل سروس میں جانا پڑا۔ میرے جانے کی دیر تھی کہ موتی لال کے سبھی حواری اپنی اپنی جگہ پر واپس لائے گئے اور حسب مقدور سیونگ بنک کمیشن کا حصہ اس تک پہنچاتے رہے۔کامریڈ موتی لال کا کمیونزم اور انصاف دار

پڑا کا پڑا رہ گیا۔

جب میں دوسری بار پوسٹنگ پر کشمیر آیا تو میں نے دولت کی خاطر اس کو جھوٹ اور مکاری کا سہارا لیتے ہوئے دیکھا یہاں تک کہ ایک ملازم اس کے نرغے میں پھنس کر ذہنی توازن بھی کھو بیٹھا۔ مائیگریشن کے سمئے پر اس کا رول بالکل منفی رہا۔ اس نے اپنی برادری کے ساتھ ایسے ایسے فریب کیے کہ خدا کی پناہ۔ ایک روز جب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں پوچھ بیٹھا۔

''موتی لال جی، اس نازک موقعے پر آپ نے اپنی برادری کے لیے کچھ بھی نہیں کیا حالانکہ آپ دہلی میں اتنے بڑے یونین لیڈر ہیں۔ کم سے کم ان کی باز آبادکاری کے لیے کچھ مثبت قدم تو اٹھا سکتے تھے۔ اس کے برعکس آپ نے ان کی سٹرائیک ناکام کروائی اور ان کو کہیں کا نہ رکھا۔'' میں نے ایک دن پہلے اس کو شراب کے نشے میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے ساتھ سمجھوتا کرتے دیکھا تھا۔

''ارے صاحب، آپ کس برادری کی بات کر رہے ہیں۔ معلوم ہے چھ مہینے پہلے میرے گردے کا آپریشن ہو چکا تھا اور میں دو مہینے اسپتال میں پڑا رہا۔ کیا مجال کہ برادری کا کوئی بھی بندہ میری عیادت کے لیے آتا۔ انہیں تو موتی لال صرف پوسٹنگ کے لیے چاہیے یا پھر انسپکٹر امتحان میں پاس کرانے کی خاطر۔ مجھے تو ان سے نفرت ہوگئی ہے۔''

میرے جی میں آئی کہ کہہ دوں۔ ''تم یہ سب کام خیرات کے طور پر تو نہیں کرتے۔ اس کا بھرپور معاوضہ لیتے ہو۔ زرِ نقد، شراب اور شباب''۔ مگر میں اس نازک وقت پر اسے الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے بڑے پیار و خلوص سے اسے سمجھاتا رہا کہ اس کی برادری پراگندہ ہو چکی ہے اور انہیں اس کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ انہیں کوئی مالی فائدہ تو پہنچا نہیں سکتا تھا البتہ نقصان ضرور پہنچا سکتا تھا۔ میرے مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے مائیگرنٹوں کی بحالی میں مزید کوئی اڑنگا نہیں لگایا۔

اسی سال وہ یونین کا الیکشن ہار گیا اور آسمان سے زمین پر آ گیا۔ اب نہ کوئی اس کے گھر آتا تھا اور نہ کوئی حال پوچھتا تھا۔ بیوی کو تو اس نے جوانی کے دنوں ہی سے فراموش کیا تھا۔ پھر اس کے پاس کس منہ سے جاتا۔ ایک لڑکا تھا مگر اس نے الگ گھر بسایا تھا اور اب خال خال ہی دکھائی دیتا تھا۔ موتی لال اکیلا، بالکل اکیلا پڑ گیا۔ اتنے بڑے گھر میں تنہائی اس کو ڈسنے لگی۔ ایک ایک دن اس کے لیے ایک برس کے برابر ہو گیا۔ غریب لاچار ملازموں سے لوٹی ہوئی دولت بھی اس کے لیے خوشیاں نہ لوٹا سکیں۔ وہ اپنے لیے موت کی دعائیں کرنے لگا مگر اس کی یہ دعائیں بھی عرش سے بے ثمر لوٹ آئیں۔

اس کی بیوی نے ہمیشہ اس کو لوگوں سے گھرا ہوا پایا تھا۔ جب دیکھو دس بیس چمچے اردگرد بیٹھے رہتے۔ کوئی گلاسوں میں شراب انڈیلتا تو کوئی بازار سے تکے کباب لے آتا۔ کوئی کھانے کی میز سجاتا تو کوئی کھانا پروستا۔ اس کی بیوی نے بارہا یاد کرنے کی کوشش کی کہ ماضی میں ان دونوں نے کب اور کہاں اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا مگر یادداشت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

پھر وہ دن بھی آیا جو ہر ایک کی زندگی میں آتا ہے۔ موتی لال کے دونوں گردوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ اسپتال سے لاش گھر لائی گئی۔ سبھی نے سجھاؤ دیا کہ داہ سنسکار کے لیے جلدی کرنا بہتر رہے گا مگر موتی لال کی بیوی نہیں مانی۔ اسے یقین تھا کہ مرنے کے وقت وہ لوگ ضرور آئیں گے جن کے ساتھ اس کے پتی پرمیشور نے اپنی زندگی کی اہم گھڑیاں بتائی تھیں۔ وہ پورے دن انتظار کرتی رہی لیکن کسی کو آنا تھا نہ کوئی آیا۔ انجام کار سورج ڈوبنے سے پہلے ارتھی اٹھائی گئی اور گھاٹ پر لے جا کر اس کا داہ سنسکار کیا گیا۔

ارتھی کے ساتھ صرف خون سے جڑے ہوئے چند رشتے دار نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

مصنف کے بارے میں

نام	:	دیپک بُدکی
پیدائش	:	۱۵رفروری ۱۹۵۰ء (سرینگر، جموں وکشمیر)
تعلیم	:	ایم ایس سی (بوٹنی)؛ بی ایڈ؛ ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، این ڈی سی (ndc)؛ مقالہ برائے نیشنل ڈیفنس کالج: (Genesis of Kashmir Problem & Article 370)
پیشہ	:	ریٹائرڈ ممبر، پوسٹل سروسز بورڈ، نئی دہلی؛ نو سال آرمی پوسٹل سروس میں ڈیپوٹیشن پر رہا، بطور لیفٹننٹ کرنل سبکدوش؛ مختصر مدت کے لیے صحافت اور کارٹوننگ سے وابستگی؛ ریڈیو اور دوردرشن پروگراموں میں شرکت۔
کارنامے	:	۱۹۷۰ء میں ادبی زندگی کا آغاز؛ ۸۷ء تا ۹۶ء قلمی تعطل؛ تقریباً ۱۰۰ رافسانے ۳۰۰ رتبصرے اور ۴۰ رتنقیدی و تحقیقی مضامین قلم بند کیے ہیں جو ہندو پاک اور مغربی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ کئی افسانے ہندی، کشمیری، انگریزی، مراٹھی اور تیلگو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ چند ایک افسانے دوردرشن پر ٹیلی وائز۔
تصانیف	:	افسانے۔ ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب؛ **مضامین وتبصرے**۔ عصری تحریریں، عصری شعور، عصری تقاضے، عصری تناظر، دورِ حاضر کے غیر مسلم افسانہ نگار و دیگر مضامین
گوشے	:	'شاعر ممبئی' ستمبر ۲۰۰۴ء، 'انتساب' سرونج ۲۰۰۶ء، 'اسباق' پونے جولائی ۲۰۰۷ء
انعامات	:	انٹرنیشنل فرینڈ شپ سوسائٹی کی جانب سے شری بی این سنگھ سابقہ گورنر آسام اور تامل ناڈو نے ۲۰۰۹ء میں راشٹریہ گورو سمان سے نوازا۔
ای میل	:	deepak.budki@gmail.com
بلاگ	:	1.deepakbudki.com 2.budki.blogspot.com